خطوط اس مجموعہ میں درج ہیں، ایسے نادر مجموعہ کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے، اس کے لیے مولانا زیدی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یادگار وحشت : مرتبہ جناب اسحٰق راشد صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶، بلاقیمت، پتہ :۔ ڈاکٹر محمد بلال کنوینر وحشت صدی ۳۰ رپن اسٹریٹ کلکتہ۔

گذشتہ برس کلکتہ میں سیّد رضا علی وحشت کلکتوی کے قدردانوں نے ان کا صد سالہ جشن منایا اور اس موقع پر یہ یادگار مجلہ بھی شایع کیا، اس کے شروع میں وحشتؔ کے فوٹو، غیر مطبوعہ خطوط، نشان خط کا نمونہ اور مختصر خود نوشت حالات درج ہیں، گو یہ مجموعہ مختصر ہے، اور بعض مضامین ہلکے پھلکے ہیں، تاہم کلام وحشت کا ترقی پسندانہ پہلو" از ل احمد اکبرآبادی" رنگ وحشت" از آغا رشید مرزا دہلوی، "چند یادیں کچھ تاثرات" از رضا مظہری، "میر کارواں وحشت" از شانتی رنجن بھٹاچاریہ، اور" وحشتؔ مرحوم اور ان کی مہارت فن" از تمنا عمادی اچھے اور مفید مضامین ہیں، ان میں وحشت مرحوم کے ضروری حالات، ادبی زندگی، شاعرانہ کمالات اور بعض قومی خدمات کا ذکر ہے، آغا رشید مرزا دہلوی کے مضمون سے ان کے اچھے ادبی ذوق اور حسن تحریر کا اندازہ ہوتا ہے، جمیلؔ مظہری، سالکؔ لکھنوی، شیداؔ دہلوی، علقمہ شبلی وغیرہ کئی شعراء کا منظوم خراجِ عقیدت بھی درج ہے، اس یادگار مجلہ کے مرتب جناب اسحٰق راشد کے مختصر تمہیدی مضمون میں تغزل کی لطافت و دل آویزی کے علاوہ اس صدی کے نصف اول کے بعض اکابر غزل گو شعراء کی عظمت کا ذکر ہے کہ انھوں نے پروفیسر کلیم الدین احمد کی اردو غزل پر پھبتی اور غزل گوئی کے خلاف ترقی پسند و جدیدیت کی مخالفانہ مہم کے باوجود اسے اردو شاعری کی آبرو سمجھا ہے، انھوں نے آخر میں وحشت کے سو منتخب اشعار بھی دیے ہیں، جناب وحشت اردو کے ممتاز غزل گو شاعر تھے، اس لحاظ سے ان کی یادگار میں شایع ہونے والے مجلہ کو زیادہ باوقار ہونا چاہیے تھا اور اس میں کلکتہ سے تعلق رکھنے والے اہل قلم کی نگارشات ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے تھا، تاہم یہ یادگار مجلہ بھی سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، اور فائدہ سے خالی نہیں۔ "ض"

جلد ۱۲۹ ماہ رجب ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۲ء عدد ۵

مضامین

شذرات

پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر محمد اشرف خان نے اپنی تصنیف سلوک سلیمانی یا شاہراہِ معرفت کی دو جلدیں دارالمصنفین کو کیا بھیجیں کہ وہاں بیٹھ کر یہاں کے لوگوں کے لیے روحانی انبساط و نشاط کا ایک خوانِ نعما بچھا دیا ہے۔

ان دونوں جلدوں میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صوفیانہ اور عارفانہ تعلیمات ہیں، وہ دارالمصنفین کے قیام میں اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی نظروں میں ایک بے مثال عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک بے عدیل سیرت نگار، ایک غیر معمولی متکلم اسلام، ایک دیدہ ور مورخ اور ایک نامور ادیب و انشا پرداز ہے، ان کی وجہ سے دارالمصنفین کا یہ دور افتادہ گوشۂ عافیت علم و فن کا ایک حصن حصین بن گیا تھا، وہ جب اپنے آخری ایام زندگی میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے تو ان میں عظیم انقلاب آیا جس سے دارالمصنفین کو سلوک و معرفت کا بھی چشمۂ حیوان بننا چاہیے تھا، مگر یہاں کے لوگ بحر ظلمات کو طے کر کے اس کے آب حیات کو نہ پاسکے، لیکن اس کے امرت دھارا سے سب سے زیادہ سیراب کراچی کے جناب غلام محمد صاحب اور پشاور کے پروفیسر محمد اشرف خان صاحب ہوئے، جناب غلام محمد نے جو کچھ حاصل کیا، اس کو تذکرہ سلیمان میں منتقل کیا، پروفیسر محمد اشرف خان نے اپنے مرشد کے یہاں سے سلوک و طریقت کا جو آب زلال پایا، اس کو اپنی تصنیف سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت میں لسواد عرفانی جو بنا دیا ہے۔

یہ دونوں جلدیں ہاتھ میں آئیں تو ندامت سے گردن جھک گئی کہ جو کام دارالمصنفین کے اندر ہونا چاہیے تھا وہ یہاں سے دور اس برصغیر کے سرحدی علاقہ پشاور میں انجام پایا ع تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے۔

اس شرم کے باوجود کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس میں رشد و ہدایت کا خزانۂ عامرہ کھلا ہوا ہے، روحانی معلومات کے سیم و زر کا انبار لگا ہوا ہے، سلوک و معرفت کی مے ارغوانی کے شیشہ و ساغر کھنکھناتے ہوئے دل و جان کو سرشار کر رہے ہیں، اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مصنف کے انداز بیان میں ان کے مرشد کے اسلوب نگارش کی جھلکیاں ہیں، پھر حضرت سلیمان اشرفی کو راہ سلوک میں جو کیف گیتی حاصل تھی وہ خود مصنف کی ذات میں سرایت ہو کر اس کتاب کی ہر سطر اور ہر لفظ میں منتقل ہو گئی ہے

اس کتاب میں جان اس لیے بھی پڑ گئی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ حضرت سید سلیمان اشرفی سے بنے نظر نہیں آتے یعنی اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کوئی مرتاض زاہد یا گوشہ گیر عابد یا کسی خانقاہ کے سجادہ نشین کے افادات و ملفوظات نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے محقق اسلام کی تعلیمات ہیں جن کی تحریروں میں کبھی ابن تیمیہ، کبھی ابن قیمؒ، کبھی غزالیؒ، کبھی مجدد سرہندیؒ اور کبھی شاہ ولی اللہؒ کے جلوے نظر آتے ہیں، انھوں نے اپنی آخری زندگی میں واردات، انتخاب شیخ، بیعت، صفات الٰہی، مراقبات، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، عقائد، اجتباء، انابت اور طلب و وصول کے متعلق جو تعلیم دی وہ محض رسمی اور روایتی نہیں ہے بلکہ ایک جدید سیرت نگار کی بلکہ سوچی سمجھی ہوئی تعلیم ہے۔

یہ تعلیم ان کے لیے بھی چراغ راہ ہے جو تصوف کو غیر اسلامی اعمال، اشغال اور غیر شرعی بدعات، مکاشفات اور مجاہدات کا مجموعہ سمجھ کر اس کو نظر انداز کرتے ہیں، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ صحیح تصوف میں احسان کے ذریعہ جس طرح مذہب کی روح بیدار کی گئی یا اخلاق میں جو جان ڈالی گئی یا ایمان میں جو کمال پیدا کیا گیا، وہی تعلیم حضرت سید صاحبؒ نے تصوف کے ذریعہ دی یعنی حقیقی اور شرعی تصوف دین کی روح، یہ اخلاص فی اللہ اور علم حصول تقویٰ کا نام ہے، یہ افلاطونی نظریہ اشراقی حکمت، رواقی دستور، اشائی عقیدہ، ہندی ویدانت اور مسیحی رہبانیت سے بالکل الگ چیز ہے، اگر اس میں احکام الٰہی کی تعمیل و تکمیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جمیل کی جلوہ سامانیوں کی ضیا پاشیاں نہ ہوں تو یہ تصوف نہیں کچھ اور چیز ہے، اسلامی تصوف میں جمال نبوی ہی سے دین میں روح، ایمان میں جان اور قلب میں تزکیہ پیدا ہوتا ہے، ایک سیرت نگار کی تعلیم یہی اور صرف یہی ہو سکتی تھی۔

حضرت سید صاحب کی اسی تعلیم کی روح پرور شرح اس کتاب کی دونوں جلدوں میں ہے، اس کی اشاعت سے پہلے اسی عنوان سے مصنف کی کچھ تحریریں پڑھ کر مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے تحریر فرمایا تھا کہ ان شاء اللہ اشرفی سلوک سلیمانی قالب میں قلم اشرف سے اشرف السلوک ہی ثابت ہوگا، اسی زمانہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی لکھا تھا کہ یہ نام کے اشرف کام کے لحاظ سے بھی اشرف نکلے، جس کسی کو بھی اس کتاب کے مطالعہ کا موقع ملے گا وہ ان دونوں بزرگوں کی رائے سے صرف اتفاق کرے گا بلکہ اس کو غیر شعوری طور پر یہ بھی احساس ہوگا کہ اگر کسی کو اخلاص دین، اخلاق باطن، تہذیب نفس، صفائی روح اور تعلق مع اللہ تعالیٰ کی تعلیم کی تلاش ہو تو اس کو اس کتاب میں ضرور مل جائے گی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ ع از سلیمان گیر اخلاص عمل۔ (رع!)

اسی اخلاص عمل کی تعلیم و تلقین کے آبدار موتی اس کتاب کی ہر سطر میں جھلملاتے نظر آتے ہیں، یہ مختصر تحریر کتاب کی رسید خاطر کی

لکھی جارہی ہے، ان شاء اللہ معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں اس پر طویل تبصرہ ہوگا۔

یوپی کی حکومت کی طرف سے اردو کو اس ریاست میں اسی طرح سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا ہے، جس طرح بہار میں یہ بنائی گئی ہے تقریباً پینتیس ۳۵ برس کے گریہ و زاری کے بعد اردو بولنے والوں کو یہ عنایت حاصل ہوئی، جب اپنا حق منوانے کی قوت اور صلاحیت ہی نہ ہو تو جو بھی رعایت حاصل ہو جائے اس کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، یو۔ پی میں اردو کا حق تو یہ تھا کہ تعلیمی اداروں میں کسی نہ کسی درجہ تک اس کی تعلیم لازمی کر دی جاتی مگر اپنی مجبوری اور بے چارگی میں اسی کو غنیمت تصور کر لینے پر قناعت کر لینا چاہیے کہ کم از کم اردو کو سرکاری درجہ تو دے دیا گیا ہے، اب یہ ریاست سے شاید در بدر نہ ہو سکیگی، اس خسروانہ مراحم کی مزید تفصیلات کا انتظار ہے، معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت بہار نے دو سال پہلے اردو کو سرکاری زبان تو تسلیم کر لیا ہے، لیکن اس کے کاغذی اعلان پر اب تک عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے، خدا کرے کہ یوپی میں یہ صورت پیش نہ آئے۔

پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے سابق پروفیسر جناب عبد المنان بیدل کی وفات گذشتہ اپریل میں ہو گئی، انھوں نے تقریباً نوّے سال کی عمر پائی، وہ اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ اپنی زندگی میں اپنے شاگردوں کو علم و ادب میں بڑی شہرت حاصل کرتے دیکھا، بڑے شفیق استاد تھے، اس خاکسار کو بھی ان کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی، اپنے زمانہ میں فارسی کی نصابی کتابیں انگریزی لباس پہن کر انگریزی زبان میں پڑھاتے وقت اس مشرقی زبان میں مغربی رنگ پیدا کر دیتے، بڑے اچھے شاعر بھی تھے، بیدل تخلص کرتے، مشاعروں میں اپنے ترنم سے اپنی شاعری میں دلنوازی، دلربائی اور دلنشینی کی ساری کیفیت پیدا کر دیتے، آخر عمر میں مذہبی رنگ بھی زیادہ غالب ہو گیا تھا، زائرین حج کی خدمت مختلف حیثیتوں سے کرتے رہے، استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے سفر حج میں ساتھ تھے، سلیمان نمبر میں ان کا ایک پُر کیف مضمون "سفر حجاز کے تاثرات" کے عنوان سے شایع ہوا، گذشتہ اگست میں ان کو حکومت ہند کی طرف سے فارسی کی سند کا ایوارڈ بھی ملا، لیکن حکومت کی یہ جوہر شناسی اس وقت ہوئی جب ان کے بہت سے شاگردوں کو ان سے پہلے اس اعزاز سے نوازا جا چکا تھا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائیں۔ آمین۔

مقالات

مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور

طریقۂ کار کا تجزیہ اور اصلاحِ حال کی راہ

از پروفیسر خلیق احمد نظامی

ہر قوم کی حیات اجتماعی کی ایک روح ہوتی ہے، جس کے صحیح ادراک کے بغیر اس کی تاریخ یا تمدن کی بنیادی حقیقتوں تک رسائی ممکن نہیں، مستشرقین نے اسلام کی تاریخ اور تہذیب کی تحقیق میں ہتم بالشان کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر اس کی داخلی معنویت کو سمجھنے سے عاجز رہے ہیں، اس ناکامی کے اسباب کی توجیہ اس وقت ممکن ہے جب ان عوامل اور محرکات کا سراغ لگایا جائے جن کے زیر اثر مستشرقین نے تاریخِ اسلام پر اپنی توجہ مرکوز کی تھی اور اس کے مذہبی افکار اور تمدنی اداروں کی نوعیت کو سمجھنا چاہا تھا، یہ محرکات کبھی مذہبی عصبیت کا سہارا لیتے تھے، کبھی مقتضائے سیاست سے ان کا رخ متعین ہوتا تھا، کبھی معاشی دور اندیشی، علمی جد و جہد کا پیکر اختیار کر لیتی تھی، مذہب، سیاست اور معاشیات کی اس تنگ نظری میں خالص علمی اور تحقیقی کاوشوں کی کیفیت گریز پا نظاروں کی سی رہتی تھی، اگر تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو مستشرقین کی تحقیقی جد و جہد کے پانچ ۵ دور سامنے آئیں گے۔

پہلا دور (۱) اسلام اور اس کے تہذیبی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کا جذبہ مغرب میں اُس وقت بیدار ہوا تھا جب اسپین اور سسلی کی سرزمین پر عربوں نے قدم رکھا تھا، یہ صرف ایک ملک یا ایک جزیرہ کی فتح نہ تھی بلکہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے ایک نئے اور انقلاب آفریں دور کا آغاز تھا، ایسا دور جس نے بقول مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر یسی یون[1] تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے امکانات پیدا کر دیے، عربوں کے علوم کو حاصل کرنے، ان کے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کی علمی سربلندی کا راز دریافت کرنے کا جذبہ اس بات کا محرک ہوا کہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے، عربوں کی نئی تحقیقات، نئے علمی تجربات، نئے علمی رجحانات سے یورپ کے عالم استفادہ کرنا چاہتے تھے، اور گو پیغمبر اسلامؐ کے متعلق جب گفتگو کرتے تو اپنے متعصبانہ جذبات کو چھپا نہ پاتے تھے، لیکن اسلام کے علمی ذخائر کے ذریعہ علمی سربلندی کا راز معلوم کرنے کی جستجو ان کے سارے جذبات پر حاوی تھی، ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ کے ایک فاضل ڈریمونڈ نے ایک محکمہ اسلامی فلسفیانہ تصانیف کو عربی سے لاطینی میں منتقل کرنے کیلئے قائم کیا، اس محکمہ میں بہت سے یہودی عالم شامل تھے، ۱۱۵۰ء میں طلیطلہ ہی کا ایک یہودی عالم ابراہیم بن عذراء انگلستان پہونچا اور علوم اسلامی کے مطالعہ کی ضرورت اور افادیت پر توجہ دلائی، اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں نے جن کی زبان عبرانی تھی عربی پر غیر معمولی قدرت حاصل کی، اور عربی کتابوں کو لاطینی اور دوسری زبانوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا، گیرارڈ ڈی کریمونا (م ۱۱۸۷ء) (Gerarddi Crimona) نے رازی اور ابن سینا وغیرہ کی تقریباً ساٹھ کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا، اسی زمانہ میں یورپی ممالک بالخصوص انگلستان کے علماء اسپین کی عرب درسگاہوں میں تحصیل علم کے لیے آنے شروع ہوئے، بارہویں صدی کے ان علماء میں ایڈیلرڈ (Adelard) کا نام

[1] روز گار فقیر۔ فقیر سید وحید الدین، ص ۱۳۶۔

خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس نے انگلستان میں نہ صرف عربی علوم کی حمایت میں بہت کچھ لکھا، بلکہ متعدد عربی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، ڈینیل آف مارلے (Daniel of Marley) نے اسپین پہونچ کر عربوں کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی، مائیکل اسکاٹ (Michael Scott) نے سسلی میں اسلامی علوم کی تحصیل کی اور پھر ارسطو کی تصانیف کا عربی سے ترجمہ کرنے میں عمر گذار دی، کلیسا نے بھی عربی علوم کی افادیت کو محسوس کیا اور پوپ جان (Pope John XXII) نے ۱۳۲۵ء میں ایک منشور کے ذریعہ اپنے نمایندے کو پیرس میں ہدایت کی کہ کالج کے عربی شعبہ کی نگرانی میں غفلت نہ برتی جائے۔

ایڈیلرڈ نے اپنی کتاب "مسائل طبیعیہ" (Natural Questions) میں عربوں کے ان احسانات کا بھی ذکر کیا ہے جس نے یورپ کی خاموش علمی فضا میں حرکت پیدا کر دی تھی، عربوں نے یورپ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عقل (Reason) کو سند (Authority) پر ترجیح حاصل ہے، یورپ کا دور احیائے علوم (Renaissance) اسی اصول کا شرمندۂ احسان تھا[1] آنے والی صدیوں میں اسی پر عمل پیرا ہو کر یورپ نے علمی دنیا کی سربراہی کا راز پایا اور وہ عظیم الشان علمی کارنامے انجام دیے جنھوں نے اس کو علمی فضیلت کی صف اول میں پہونچا دیا، اقبال نے اسی دور کے عربوں کے کارناموں کے پیش نظر کہا ہے ؎

حکمتِ اشیاء فرنگی زاد نیست | اصلِ او جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است | ایں گہر از دستِ ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد | علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند | حاصلش افرنگیاں برداشتند

[1] انگلستان اور عربی علوم و فنون۔ برنارڈ لیوس کی تقریریں، ص ۵ - ۴

دوسرا دور (۲) مستشرقین کی علمی سرگرمیوں کے دوسرے دور کی ابتدا صلیبی جنگوں سے ہوتی ہے گو بعض مستشرقین جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، صلیبی جنگ کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی علمی جد و جہد کا مرکز اسلام نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے وہ علوم و فنون تھے جن کے حصول میں انھوں نے کسی تعصب کو قریب نہیں آنے دیا، مولانا شبلیؒ نے اس دور کے مستشرقین کی علمی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: "یورپ کی فیاض دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلہ ربائی شروع کر دی۔"[1] لیکن اس فیاضی کا تعلق غیر مذہبی لٹریچر سے تھا، جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، صلیبی جنگ کے بعد مستشرقین کے طرز فکر اور انداز تحقیق میں بنیادی تبدیلی رونما ہوگئی، اب اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ اور اسلامی تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا تھا جو ان کے متعصبانہ افکار کی زد میں نہ آگیا ہو، انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کا رخ اسلام کو غیر مہذب اور وحشیانہ مذہب ثابت کرنے کی طرف موڑ دیا، اس لیے کہ اسی میں ان کو عیسائیت کی مدافعت کی راہ نظر آتی تھی، کتنے ہی غلط اور بے بنیاد الزام تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اس دور میں تراشے گئے، اور ان کو شہرت عام دے دی گئی، حضرت عمرؓ کی نسبت کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا حکم اسی زمانہ میں مستشرقین نے وضع کیا اور اس کو اس طرح مشہور کیا کہ اپنے پرائے سب کو اس کی صداقت پر یقین آگیا۔ اس زمانہ میں یورپ نے مسلمانوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے ان کے متعلق گمراہ کن خیالات کو قومی گیتوں میں اس طرح سمو دیا کہ یہ جنگی معرکوں میں رجز کے طور پر گائے جانے لگے۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ جب کسی شخص کو عیسائی بنایا جاتا تھا تو یہ خیالات عقائد کے طور پر اس کو سکھائے جاتے تھے۔

[1] مقالات شبلی ج ۵ ص ۵۔

مستشرقین نے اسلام کی جو غلط تصویر اس دور میں پیش کر دی تھی وہ مدتوں تک یورپ اور اس کے زیر اثر علاقوں میں تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی رہی۔

تیسرا دور (۳) مستشرقین کی علمی جد و جہد کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب صنعتی انقلاب نے یورپی ممالک میں استعمار اور ملک گیری کی نئی خواہشات کو بیدار کر دیا، اب یوروپین اقوام نے مسلمان ملکوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنی شروع کر دیں، ان حالات میں اسلام کی طرف کھلا ہوا غن سیاسی مصالح کے منافی نظر آنے لگا، ان ملکوں پر اقتدار کے مضبوط پنجے جمانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایک پیچ و خم، ان کے افکار و احساسات کی ایک ایک خلش اور ان کے سماجی رجحانات اور دینی شعور کے ایک ایک نشیب و فراز کا پتہ لگایا جائے، محکوم کے دل و دماغ تک پہونچے بغیر حکمراں کی کوئی ساحری کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یوروپین ممالک نے سب سے پہلے اپنی یونیورسٹیوں اور اداروں کی طرف دیکھا اور بہت افزا جواب پایا، سترہویں صدی میں کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا بندوبست کیا گیا اور اسلام کے علمی ذخائر کو جگہ جگہ سے سمیٹ کر لانے کے منصوبے بنائے گئے، آکسفورڈ کے عربی پروفیسر ایڈورڈ پوکاک (Edward Pococke) نے حلب سے عربی مخطوطات کے بیش بہا ذخیرے حاصل کیے اور انجیر کے ایک درخت کے سایے میں جو وہ شام سے لایا تھا (اور جو اب تک وہاں موجود ہے) عربی تصانیف کے خلاصے کرنے شروع کر دیے، تاکہ مسلمانوں کے ملی مزاج اور علمی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہو سکے، جارج سیل (George Sale) نے اسی زمانہ میں قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کیا، یوروپی زبانوں میں قرآن کا یہ پہلا مکمل ترجمہ تھا، استشراق کی یہ لہر جو مقتضیات سیاسی نے تیز تر کر دی تھی یورپ میں اس طرح پھیلی کہ ہر ملک مسلمانوں کی زبان، تاریخ اور مذہب کی تحقیق میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگا

جرمنی میں ریسکے (م ۱۷۷۴ء) (Reiske) سوئٹزرلینڈ میں برک ہرڈ (م ۱۸۱۷ء) (Burkhard) فرانس میں سلویسٹر دی ساسی (Sylvestre de Sacy) ہالینڈ میں ڈوزی (Dozy) انگلستان میں رابرٹسن اسمتھ (Robertson Smith) نے اسلامی تاریخ اور ادب پر تصانیف کے انبار لگا دیے برکہارڈ (Burkhard) نے تو مسلمان بن کر شام اور حجاز کا سفر کیا، پیرس، میڈرڈ، برلن، لندن، لائڈن، آکسفورڈ کے علوم شرقی کے شعبوں میں اسلام پر تحقیقی کام میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہونے لگا، نپولین نے ۱۷۹۸ء کے بعد مصر کے علمی ذخیروں کو فرانس منتقل کرنا شروع کر دیا، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے نادر قلمی نسخے لندن پہونچا دیے، انڈونیشیا، ہندوستان، ایران، مصر، شام، عراق کے کتنے ہی انمول موتی جن کو غیر ملکوں میں دیکھ کر بقول اقبال "دل سی پارہ" ہوتا ہے، یوروپین کتب خانوں کی زینت بن گئے۔ نپولین نے وقت کے استادوں کو سمجھا اور ازہر کے ساٹھ علماء کے سامنے اسلام سے اپنے احترام کا اعلان کیا اور اپنے نائب کلیبر (Kleber) کو ہدایت کی کہ حکومت کے معاملات میں مسلمانوں کے مذہبی طبقوں کا تعاون حاصل کرے[1]، یہ سب سیاست کے تقاضے تھے جن کا اظہار آکسفورڈ سے لے کر ازہر تک مسلسل ہوتا رہا تھا۔

اس زمانہ میں صلیبی دور کا کھلا ہوا معاندانہ انداز مصلحتاً ترک کر دیا گیا، لیکن مقصد کے نشتر تیز تر ہو گئے، اب ساری جد وجہد کا رخ اس طرف تھا کہ مسلمانوں کو ذہنی طور پر مرعوب کر کے ایسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ ہر معاملہ میں ہدایت و رہبری کے لیے مغرب کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوں، تشکیک اور شبہات کے ذریعہ ان کے قوائے ذہنی کو اس طرح مفلوج کر دیا جائے کہ وہ نہ صحیح سمت میں قدم اٹھا سکیں، نہ صحیح زاویۂ نگاہ سے چیزوں کا جائزہ لے سکیں، پوست

---

[1] Thiry, Bonaparte en Egypte p. 434.

پلائے ہوئے انسان کی طرح نہ اعضائے جسمانی ان کے قابو میں ہوں، نہ قوائے ذہنی پر ان کا بس چلے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے متعلق مستشرقین کے کام کے دو پہلو خاص طور پر جاذب توجہ نظر آتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ پر کام کرنے والے بہت سے مصنفین فوج سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً ریورٹی (Raverty)، برگس (Briggs) اسکاٹ (Scott) ڈاؤ (Dow)، ڈیوی (Davy)، دوسرے یہ کہ سیاسی مقاصد کے پیش نظر مسلمانوں کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی وہ شگفتگی برقرار نہ رہ سکے جو صدیوں تک ان کی سماجی زندگی کی خصوصیت رہی تھی، سر ہنری ایلیٹ نے یہ کام آٹھ ضخیم جلدوں میں انجام دیا، ہمیں ایلیٹ کا مشکور ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے مقاصد کا اظہار ایک عرضداشت (Memorandum) میں انگلستان کی حکومت سے کرنے کا فیصلہ کیا، اس عرضداشت کو بعد میں کتاب کا جزو بنا کر شایع کر دیا گیا، بغیر یہ سوچے کہ مستشرقین کے خلاف یہ سب سے بڑی دستاویز ہے جو ان کے مفسدانہ مقاصد کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح مصر کے متعلق یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ نپولین کے بیشتر مددگار اور ترجمان فرانس کے مشہور مستشرق سلوسٹر دی ساسی کے شاگرد رشید تھے، اور جب دی لیسپس (de Lesseps) نے نہر سوئز کو جاری کیا تھا تو اس کے عزائم کو کامیاب بنانے میں کتنی ہی فرانسیسی مستشرقین کی بے تاب تمنائیں کام کر رہی تھیں۔

اس دور کے مستشرقین نے زہر کی تلخیوں کو تحقیق کے شہد میں اس طرح چھپایا کہ کام و دہن کو تو تلخی محسوس نہیں ہوئی، لیکن زہر رگ و پے میں اتر گیا۔

چوتھا دور (۴) جب نو آبادیاتی نظام کا دم واپسیں شروع ہوا اور اسلامی ممالک میں آزادی کی

تحریکیں نمودار ہونے لگیں تو مستشرقین کے اندازِ تحقیق اور طریقۂ کار میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوگئی، نو آبادیوں کی آزادی کو ٹالنا اب ممکن نہ رہا تھا، لیکن ان سے بے تعلق ہو جانا ملک کے سیاسی اقتدار پہ ضربِ کاری کے مترادف تھا، چنانچہ اب تمدنی رشتوں کی نئی زنجیریں وضع کرنے کے لیے اسلامی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہوگیا، دولتِ برطانیہ نے اپنی نو آبادیوں سے دستبردار ہونے میں پس و پیش نہیں کیا، لیکن تمدنی سرمایہ کو (جو آج بھی کتابوں اور آثار کی شکل میں انگلستان کی زینت بنا ہوا ہے) واپس کرنے سے انکار کر دیا، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس دور کے مستشرقین کی تحقیقی کاوشوں میں رنگِ احترام آگیا، اقبالؔ نے ۱۹۳۲ء میں جب پروفیسر مسی نیون سے کہا کہ مغرب کے مورخین کو اسلام سے جو تعصب و عناد ہے وہ وقت گذرنے کے ساتھ کم ہو رہا ہے، اور اسلام کی صداقت اور حقیقت ان پر آشکارا اور واضح ہوتی جارہی ہے، تو مسی نیون نے ان کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ فکر کی یہ تبدیلی مقصد بدل جانے کا نتیجہ تھی، اب سیاسی برتری قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ بظاہر اپنے اندازِ تحقیق میں اسلام کے ساتھ احترام کا برتاؤ کیا جائے، مبادا سیاسی آزادی کی تحریکیں مغرب کی ذہنی غلامی سے بغاوت کا رنگ اختیار کرلیں، لیکن دوسری طرف ایسے فتنوں کو خاموشی سے بیدار کر دینے کی جستجو شروع ہوگئی جن سے مسلمان ممالک افتراق اور انتشار کا شکار بنے رہیں، اور ملی وحدت کی پرچھائیاں بھی ان کے ذہن پر نہ پڑنے پائیں۔ اس دور کے مستشرقین اپنے ملکوں کی وزارتِ خارجہ کے مشیر بن گئے، اور ان کی تحقیق اگر ایک طرف مغربی حکومتوں کی خارجی پالیسی کا رخ متعین کرنے لگی تو دوسری طرف ان علاقوں میں خیالات کی تبدیلی لانے کے لیے وزارتِ خارجہ ان مستشرقین سے مدد لینے لگی، جو کام کبھی سپاہیوں کے ذریعہ

[1] روزگار فقیر ص ۱۳۵

انجام پاتا تھا، اب پروفیسروں کے ذریعہ انجام پانے لگا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد انگلستان میں اسکاربرو رپورٹ (Scarbrough Report) تیار ہوئی جس کو بجا طور پر[1] Charter of Modern Orientalism (استشراق جدید کا منشور) کہا جا سکتا ہے، اس رپورٹ میں اس بات کا شدید احساس ملتا ہے کہ اگر نئے ابھرتے ہوئے مشرق کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا تو برطانوی مقاصد بری طرح متاثر ہوں گے۔ ان مقاصد کو World Peace (امنِ عالم) کا معصوم نام دیا گیا ہے، لیکن سامراجی جذبات انکار کا نیا چولہ بدل کر اس رپورٹ کے ایک ایک حرف سے جھانکتے نظر آتے ہیں، ایچ۔ اے۔ آر گب (H. A. R. Gibb) نے Modern Trends in Islam میں نئے انداز سے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے، اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر عالمِ اسلام پر نظر ڈالی ہے۔

پانچواں دور (۵) مستشرقین ابھی اسی دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے کہ اسلامی ممالک میں زرِ سیال کے چشمے ابل پڑے اور دنیا کا مرکزِ ثقل عرب ممالک کی طرف منتقل ہوگیا، مستشرقین کے حاشیۂ خیال میں بھی ایسی صورت نہ تھی، اسلامی ممالک کی اقتصادی آزادی کے خیال نے ان کی استعمارانہ فکر کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے، نئی صورتِ حال کے امکانات ان کے لیے تشویش بلکہ توحش کا باعث بن گئے، اقتصادی اعتبار سے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش برابر جاری ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ قرونِ اولیٰ کے اسلام کے مطالعے سے بے توجہی برتی جارہی ہے، اب مستشرقین کی دلچسپی جدید مذہبی تحریکات، سماجی رجحانات اور اقتصادی امکانات کے مطالعہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے، اور فکرِ اسلامی کی توجیہ اور تعلیل سے

[1] A. J. Arberry, Oriental Essays. P. 241

زیادہ مسلمان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کے تجزیے کی طرف توجہ ہے، قومیت (Nationalism) کے وہ عناصر جو عربوں کی وحدت ملی کے تصورات کو پارہ پارہ کرسکتے ہیں، اب توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صیہونیت نے مستشرقین کے انداز تحقیق سے خاموش ساز باز کرلیا ہے۔

شاید تاریخ کے کسی دور میں دیار مغرب کے رہنے والوں کو اسلام سے وہ دلچسپی پیدا نہیں ہوئی جو عصر حاضر کا خاصہ بن کر سامنے آئی ہے، حالات کی اس نئی کروٹ نے مستشرقین کو ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے، ان کا ترکش خالی ہے اور حالات کچھ اور ہی رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں، اس زمانہ میں مستشرقین نے جو کام اسلام پر کیے ہیں، وہ اسلام سے زیادہ خود ان کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں Area Studies کے تصور کو اقتصادیات، سیاست ارضی geopolitics اور عمرانیات (sociology) سے قریب لاکر دینی عناصر کے مطالعے سے گریز کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۶ء میں امریکہ میں The Midle East Studies Association of North America قائم ہوئی اور ۱۹۶۷ء میں British Society for Mid-Eastern Studies کا قیام عمل میں آیا، یہ انجمنیں بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی مطبوعات اور رسائل سے ان ذہنی خلشوں کا اندازہ ہوجاتا ہے جن سے مستشرقین اس وقت دوچار ہیں، کبھی Hydro Politics of the Nile Valley (John Waterbury — 1979) کی طرف ان کی نظر جاتی ہے، کبھی Islam and Colonialism: The Doctrine of gihad in Modern History (Rudolph Peters. Mouton 1979)

پر غور کرتے ہیں، لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں کہ اسلامی فکر کا دھارا اب کس رخ بہے گا۔ اور انھیں کہاں کہاں اور کیا کیا بندھ باندھنے چاہئیں، ایک جدید ترین کتاب Islam and the West کے مصنف Normal Danial نے مستشرقین کی تصانیف پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ Latin Europe نے اسلام کے خلاف بہت سے غلط نظریات پھیلائے تھے، لیکن اس کی عصبیت اس کو "علمی بددیانتی" تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

یہ ہیں وہ پانچ دور جن میں مستشرقین کی فکر، ان کے مقصد و منہاج، محرکات و محسوسات کی پرورش ہوئی، اور جن کے زیر اثر ان کی علمی کاوشیں وقت اور حالات کا ساتھ دیتی رہیں۔

مقاصد (۱) افراد کی زندگی میں جو حیثیت حافظہ کی ہے، قوموں کی زندگی میں وہی اہمیت ان کی تاریخ کی ہے، مستشرقین کے پیش نظر سب سے زیادہ اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق ان کی حیاتِ اجتماعی کے دینی، تمدنی اور فکری سرچشموں سے منقطع کر دیا جائے تاکہ جب وہ کسی انسانی کمال یا کارنامے کا تصور کریں تو ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف منتقل ہی نہ ہوسکے، بقول مولانا شبلیؒ "ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کر لیا ہے، بلکہ یہ رونا بھی ہے کہ ہمارے مردوں پر یورپ کے مردوں نے فتح پالی ہے"[1] اس مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کو علمی اعتبار سے ایسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی جس سے ان کی فکر کے سوتے خشک ہوجائیں، ان کی خودی ختم ہو تو ان کی گردنوں میں برگساں اور ہیگل سے عقیدت کی زنار ڈالی جائے۔

(۲) ایک ایسے دور میں جب کہ اسلامی ممالک میں معرکۂ سائنس و مذہب برپا تھا اور سائنس کی ایجادات نے ایک ذہنی خلش پیدا کر دی تھی، مستشرقین کی جہد و سعی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ مسلمان

[1] مقالات شبلی ج ۵، ص ۱

سائنس کی برتری تسلیم کر کے اپنے مذہب سے بیزار ہو جائیں، ان کو اپنا قانون، اپنی شریعت، اپنا طرزِ زندگی سب فرسودہ اور بیکار نظر آنے لگے، مسلم پرسنل لا میں تبدیلی اور اصلاح کا آوازہ سب سے پہلے مستشرقین ہی نے بلند کیا تھا، یورپ میں سائنس اور مذہب کا معرکہ جلدی شروع ہوا، اور جلد ہی ختم بھی ہو گیا، مستشرقین نے مشرق میں اس جنگ کو طول دے دیا تاکہ مسلمانوں کو قدم قدم پر اپنے مذہب کے ناقص ہونے کا احساس ہو اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اسلام اس معرکہ میں ناکام ہو چکا ہے۔

(۳) مسلمانوں کے ذہن کو ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے جن کا ان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو، لیکن جو قوائے ذہنی کو مضمحل کرنے میں کارگر ثابت ہوں، اقبال کی نظم میں ابلیس کا جو مشیر مسلمانوں کو ان گتھیوں کے سلجھانے کی تلقین کرتا ہے:

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اس کے پہلو میں مستشرق ہی کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔

(۴) اسلامی تاریخ کے ایسے گوشوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر زیرِ بحث لایا جائے جو مسلمانوں میں اتحادِ ملی کے جذبات کو نشو و نما پانے سے روک دیں، اس مقصد کے پیش نظر مستشرقین نے کتنی ہی عداوتوں کو جو وقت کے ساتھ بے جان ہو چکی تھیں نئی زندگی بخش دی۔

طریقۂ کار (۱) سب سے زیادہ مؤثر حربہ جو ان مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا، وہ اسلام کے علمی ذخیروں پر قبضہ تھا، یورپ کے علمی اداروں، قومی میوزیم اور کتب خانوں میں تاریخ اسلام کے سارے ماخذ جمع کر دیے گئے۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسلمان اپنی تاریخ کے ماخذ کے لیے

مستشرقین کے مکمل طور پر دست نگر ہو گئے۔

(۲) ایک پُر فریب معروضی نقطۂ نگاہ نے ان علمی کاوشوں کی حقیقی نوعیت کو نظروں سے پوشیدہ کر دیا، مثلاً جرجی زیدان نے چار جلد والی تمدنِ عرب کی تاریخ لکھی جس میں بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی، لیکن در پردہ مسلمانوں پر سخت اور متعصبانہ حملے کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی[1]۔

(۳) مستشرقین نے بعض نظریات کو جو بنیادی طور پر غلط اور گمراہ کن تھے اس خود اعتمادی اور بلند آہنگی کے ساتھ پھیلایا کہ خود مسلمانوں کو ان کی صداقت پر یقین آ گیا۔

بمن چنداں گنہ از بد گمانی می کند نسبت کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

(۴) مستشرقین کا ایک مخصوص طرزِ استدلال جس کے اثرات تو سب مسلمانانِ عالم محسوس کرتے تھے، لیکن اس کی نفسیاتی مصلحتوں کا احساس بہت کم لوگوں کو تھا، یہ تھا کہ دروغ بیانی اور افتراؤں کے دفتر جب کھولے جائیں تو موقع بموقع ایسے جملے ضرور کہے جائیں جن سے مسلمان پڑھنے والوں کو طیش آ جائے اور وہ سکون کے ساتھ ان کے پیدا کیے ہوئے مفسدوں کا جواب نہ دے سکیں۔ سب سے پہلے مولانا شبلیؒ نے اس طرزِ استدلال کے نفسیاتی پہلو کو طشت از بام کیا اور لکھا: "خود مجھ پر بھی یہی اثر پڑا ہے، لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش و غضب سے فائدہ اٹھائیں[2]۔" سر سیدؒ نے جب میورؔ کی کتاب کو دیکھا تھا تو بقول خود ان کا دل جل کر کباب ہو گیا تھا، لیکن سر سیدؒ یا مولانا شبلیؒ کی طرح جذبات پر قابو پا کر مدلل اور سنجیدہ گفتگو کرنا ہر شخص کے لیے ممکن نہ تھا، چنانچہ بعض لوگوں نے طیش میں آ کر مستشرقین کو صرف برا بھلا کہا اور اصل مفسدہ اپنی جگہ پر بدستور باقی رہا، بعض نے ان کے بیانات کو ناقابلِ اعتنا قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی۔ جن

---

[1] مقالاتِ شبلی ج ۴، ص ۱۴۳ [2] مضامین عالمگیر ص ۵۰۔

لوگوں نے جواب دینے کی کوشش کی، ان کو عذر خواہ حامی" (Apologist) کہہ کر خود ان کی نظر میں ان کو گرا دیا گیا۔ مستشرقین کے طریقۂ کار کے یہ نہایت موثر حربے تھے جو موقع اور مصلحت سے استعمال کیے جاتے تھے۔

(۵) مستشرقین کا سب سے زیادہ اہم کارنامہ جس کے ذریعہ اگر ایک طرف اسلامی علوم کے متعلق معاصرین کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، تو دوسری طرف مسلمانوں کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا دروازہ نہ صرف بند ہو گیا ہے، بلکہ صدہا ایسی غلط فہمیاں عام ہو گئیں جن کا دور کرنا آسان کام نہیں رہا،
Encyclopaedia of Islam، Dictionary of Islam، Bibliotheque Orientale، Muslim Theories of Finance
جیسی کتابوں کی اشاعت ہے، ان کتابوں کی ترتیب اور تیاری میں جو علمی کاوشیں کی گئی ہیں، وہ اپنی جگہ مسلم ہیں، اور کوئی دیانت دار مصنف ان کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کر سکے گا، لیکن ان میں جن نظریات اور افکار کو بین الاقوامی علمیت کا ٹھپا لگا کر رواج دے دیا گیا ہے، ان کی تردید و اصلاح کے لیے بڑا علمی تبحر اور اس سے زیادہ محنت و جانفشانی درکار ہے، نتیجہ ظاہر ہے، اسلام کے فقہی، تمدنی، سیاسی تمام مسائل پر ان تصانیف کو حرف آخر کا درجہ دے دیا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس صورت حال کے خلاف آواز اٹھائی اور انڈین ہسٹری کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس (۱۹۴۴ء) میں کہا: "یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانلڈ کی کتاب کے ذریعہ بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ہیوز کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرنلڈ، اگناڈیز کی عینک سے دیکھے جاتے ہیں، ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیشروؤں کی غلطی کی غلط پیروی میں مصروف ہیں۔"[۱]

۱۔ مقالات سلیمان حصہ اول، ص ۴۳۔۴۴۔

(۶) مشرقی علوم بالخصوص اسلام کے مطالعہ کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں جو شعبے قائم کیے گئے وہاں مسلمان طلبہ کثیر تعداد میں استفادہ کے لیے جمع ہوئے، یہ طلبہ بعد کو اپنے ملکوں کے اداروں کے سربراہ بنے، مستشرقین کی مقبولیت بڑھانے میں ان طلبہ کا خاص حصہ تھا، ان پر مغربی استادوں کی تعلیم کا ایسا جادو تھا کہ "آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم" کی کیفیت ان پر طاری رہتی تھی اور جن خیالات کی اشاعت خود مستشرقین کے لیے شاید ممکن نہ ہوتی، وہ ان طلبہ کے ذریعہ بہت آسان بلکہ موثر ہو گئی، اگر انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل کے اسلامی ملکوں کے علمی اداروں اور ان پر مستشرقین کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان شاگردوں کے ذریعہ مستشرقین کس طرح اسلامی دنیا کے پورے علمی افق پر چھا گئے تھے،

(۷) ان شاگردوں کی فکر کو مسلسل اپنے نظریات اور تحقیقات کے حصار میں رکھنے کا کام ان استادوں نے انجمنوں، کانفرنسوں اور رسالوں سے لیا، ۱۷۷۸ء میں سب سے پہلی ایشیاٹک سوسائٹی قائم ہوئی، ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، ۱۸۲۱ء میں پیرس ایشیاٹک سوسائٹی وجود میں آئی، ۱۸۲۳ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۸۴۲ء میں امریکن اورینٹل سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی، ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی فکر میں کوئی خلا ایسا نہ رہنے دیا جائے جس کو وہ اپنے ہی تحقیقی کام سے پُر کر لیں۔

پھر بعض کانفرنسیں ترتیب دی گئیں جن کے مقاصد بظاہر علمی تھے، لیکن جن کے ذریعہ مختلف ملکوں کی وزارت خارجہ کی پالیسیاں بروئے کار لائی جاتی تھیں، بے شمار جریدوں کی اشاعت نے مستشرقین کا علمی رابطہ پوری علمی دنیا سے قائم رکھا، ناانصافی ہوگی اگر اس سلسلہ میں مستشرقین کی کوششوں کو خراج تحسین ادا نہ کیا جائے، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ان تمام کوششوں کی باگ ڈور دفاتر خارجہ کے ہاتھ میں تھی، اور ان سے بہت سے دوسرے مقاصد بھی حاصل کیے جاتے تھے، مولانا شبلیؒ نے مارگولیتھ کے ذکر میں بڑی صحیح بات لکھی ہے کہ "تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں

خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے۔[1]

مستشرقین اپنے علم کے سہارے اسلامی تہذیب کی روح تک پہونچنے میں تو شاذ و نادر ہی کامیاب ہوئے لیکن ان کی متعصبانہ تیز نگاہی نے اس کی روح کو مجروح کرنے کا سامان ضرور مہیا کر دیا۔

ہندوستان میں ردعمل ہندوستان میں مستشرقین کے طریقۂ کار اور انداز فکر کے خلاف علی گڑھ، دیوبند، ندوۃ العلماء تینوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں آواز اٹھائی، عجیب اتفاق تھا کہ سب سے پہلا ٹکراؤ اس شخص سے ہوا جو ہندوستان میں مغربی علوم کا سب سے بڑا داعی تھا، جب ولیم میور کی کتاب سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر شایع ہوئی تو اس کی مفسدہ پردازی اور دروغ گوئی پر سرسیدؒ تڑپ اٹھے، ان کا ردعمل ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، انھوں نے لندن میں خطبات احمدیہ تیار کیے اور میور کے ایک ایک اعتراض کا نہایت دندان شکن جواب دیا، سرسید کا آخری مضمون جو انھوں نے وفات سے چند دن قبل لکھا تھا، ازواج مطہرات سے متعلق تھا،[2] جس میں مستشرقین کے مفسدانہ خیالات کی قلعی کھولی گئی ہے،

مولانا عبدالحلیم شررؔ کا بیان ہے کہ سرسیدؒ کے پاس ایسے مسلمان طلبہ کے خطوط تھے جنھوں نے لکھا تھا کہ اگر یہ خطبات ان کو نہ ملتے تو وہ مذہب اسلام چھوڑ بیٹھتے، سرسیدؒ ان خطوط کو اپنے لیے سرمایۂ آخرت سمجھتے تھے۔[3] اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرسید یورپ کی تقلید میں پیش پیش تھے، لیکن انھوں نے مستشرقین کے خلاف آواز اٹھانے میں بے پناہ عزم، غیر معمولی جرأت اور حیرت انگیز علمی تبحر کا ثبوت دیا، اور خود مستشرقین کے وضع کیے ہوئے ہتھیار ان کے خلاف

۱؎ سیرۃ النبی ج ۱، ص ۷۰، ۲؎ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین اور انسٹیٹیوٹ گزٹ، اپریل ۱۸۹۸ء

۳؎ سرسید کی دینی برکتیں، ص ۹

استعمال کیے۔

ہندوستان میں مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کے خلاف جن علماء نے پیہم جد وجہد کی اُن میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور سید امیر علیؒ کے نام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، ہندوستان میں 'مشنری' اور 'مستشرق' کی سازش نے نازک صورت حال پیدا کر دی تھی، میور نے خود لکھا ہے کہ اس نے اپنی کتاب پادری فنڈر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھی تھی، مولانا کیرانویؒ اور مولانا مونگیریؒ نے مشنریوں اور مستشرقین کے اس اتحاد عمل کا مقابلہ کیا اور بڑی ہمت اور استقلال سے بہت سے فتنوں کا سد باب کیا، مولانا کیرانویؒ کی کتابیں ازالۃ الاوہام، ازالۃ الشکوک، احسن الحدیث، اظہار حق، فرانسیسی، انگریزی، جرمن اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں، مولانا مونگیریؒ کی کتابوں پیغام محمدی، ساطع البرہان، برہان قاطعہ وغیرہ نے مشنریوں اور مستشرقوں کی سازش کو ناکام بنایا۔

مولانا شبلیؒ مدت العمر مستشرقین کی پیدا کی ہوئی گمراہیوں سے برسرپیکار رہے، قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ جب لندن ٹائمس میں کیا گیا تو مولانا شبلیؒ نے اس پر پُرزور تنقید کرتے ہوئے کہا: "ہم بتادیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا"[1] اس ایک جملہ میں اس ذہنی کاوش کا پورا پس منظر سمٹ آیا ہے، جو مستشرقین کی ان کوششوں کا محرک تھا، پادری بروکلی نے تعدد ازدواج پر اعتراضات کیے تو مولانا شبلیؒ کا قلم حرکت میں آیا، جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلام کی پردہ دری کا کام بھی مولانا شبلیؒ ہی نے انجام دیا۔[2] آرمینیا کے جھگڑوں میں مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں عیسائی رعایا کے ساتھ ماضی میں شدید مظالم ہو چکے ہیں اور اسلام میں یہ ظلم جائز، بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے، مولانا شبلیؒ نے حقوق الذمیین اور الجزیہ لکھ کر ان الزام تراشیوں کو بے اثر

۱؎ مقالات شبلی ج ۱، ص ۶۴-۶۶ ۲؎ ایضاً ج ۴، ص ۱۳۳۔

کر دیا، جب سیرۃ النبیؐ پر قلم اٹھایا تو سب سے پہلے مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کا جائزہ لیا، اسی مقصد کے پیش نظر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۱۱-۱۲ء میں الندوہ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین شائع کیا، جن میں مستشرقین کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے[1]۔

ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن مستشرقین کے افکار اور انداز تحقیق کا گہرا مطالعہ کیا، انھوں نے مسلم نوجوان سے جس کی آنکھیں مغرب اور مستشرق دونوں سے خیرہ ہو رہی تھیں، خاموشی سے کہا:

معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے

اور پھر اس کی خودی اور خود اعتمادی کے گرے ہوئے مینارے اور ٹوٹے ہوئے حصار کی تعمیر میں لگ گئے، اقبال نے مستشرقین کی علمی برتری کا طلسم توڑا، ان کے پُرفریب معروضی نقطۂ نگاہ کو بے نقاب کیا، مسلمانوں کو خود اعتمادی کا بھولا ہوا سبق پڑھایا اور بتایا کہ جدید سائنس مغربی الاصل نہیں ہے، اس کی ابتدا مسلمانوں سے ہوئی ہے، یورپ نے اس کو روح انسانی کے کچلنے کے لیے استعمال کیا، مسلمانوں کو مغربی علوم کے سلسلہ میں "بولہب را حیدر کرار کن" پر عمل کرنا چاہیے، اقبال نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اس ذہنی غلامی اور احساس کمتری سے نجات دلائی جو مستشرقین کی پیدا کی ہوئی تھی اور جس نے مسلمانوں کی فکر کے سوتے خشک کر دیے تھے، انھوں نے اپنے خطبات میں جس طرح مسلمانوں کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید کا سوال اٹھایا ہے اور جس طرح علوم مغربی اور مستشرقین کے احساس برتری کو بے جان کر دیا ہے، وہ تاریخ اسلام میں یادگار رہے گا۔

کام کا اعتراف — مستشرقین کی سرگرمیوں کی یہ روداد بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ "ہنرش نیز بگو" کے تحت ان کی خدمات کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا جائے، علوم اسلامی پر کام کرنے میں انھوں نے

[1] الندوہ، جولائی ۱۹۱۲ء (۲۹-۱۸) اگست (۲۶-۲۰) نومبر (۲۳-۱۵) وغیرہ۔

جس بے پناہ لگن، غیر معمولی انہماک اور مسلسل جد و جہد کا ثبوت دیا اور اپنی پوری پوری زندگیاں مختلف اسلامی علوم اور فنون کے مطالعہ اور تحقیق میں بسر کر دیں اس کو نظر انداز کرنا حق اور دیانت کے خلاف ہوگا، مولانا ابو الکلام آزادؒ نے مستشرقین کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا: "تاریخ و ادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کے الگ کر دینے کے بعد عربی اور مسلمانوں کا کشکول خالی ہو جاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آ رہی ہیں"۔ مولانا شبلیؒ نے طبقات ابن سعد، مناقب عمر بن عبد العزیزؒ، تجارب الامم وغیرہ کی اشاعت پر مستشرقین کو مبارکباد دی تھی، اور ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا تھا، تاریخ، جغرافیہ، لغت، طب، فلسفہ، ادب پر قدیم مسلمان علماء نے جو بیش بہا علمی کام کیے تھے اُن کو مستشرقین کے ذوق نے تباہی سے بچایا اور علمی حلقوں تک پہونچایا۔

نکلسن کے متعلق آربری (Arberry) نے ایک بار بتایا تھا کہ مثنوی کا رات دن مطالعہ کرتے کرتے اس کی بینائی جاتی رہی تھی، مارگولیتھ کے متعلق مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ میں لکھا ہے: "اس نے، مسند امام حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے، اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا[1]۔" گولڈزیہر (Goldziher) اور ونسنک (Wensinck) نے احادیث کی ترتیب کی طرف توجہ کی تو حدیث کے سارے ذخیروں کو کھنگال ڈالا، حقیقت یہ ہے کہ نکلسن، میسی نیون، آربری، گب وغیرہ کی پُرخلوص علمی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مستشرقین کی اس لگن اور انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ اور تمدن کے سارے ماخذ ان کے قابو میں آگئے، K. Niebuhr کا واقعہ اس سلسلہ میں بڑا سبق آموز ہے، اس نے عرب ممالک میں کچھ قدیم کتبات دریافت کیے تو وہاں کا کوئی عالم ان کو نہ سمجھ سکا، جب ان کتبات کی نقلیں جرمنی میں Reiske کو

[1] سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۶۹

بھیجی گئیں تو بواپسی ڈاک جواب مل گیا، علمی اعتبار سے قطع نظر اگر محض جذبہ اور ادراک کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مسلسل اسلام کے مطالعہ نے ان کی زندگی کو کس حد تک متاثر کیا تھا، یہی جب سورہ کہف پڑھتا تو اس کے چہرے پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی تھی، گوئٹے (Goethe) قرآن پاک کے متعلق کہا کرتا تھا: "جب میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے"[1] اناماری شمل کی تصوف اسلام میں غیر معمولی دلچسپی جذبات و احساسات کی گہرائی کی غماز ہے، ایک بار شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریر دیکھ کر ان کے چہرے کی جو رنگت ہوئی اور جس طرح "برکت" کے خیال سے انھوں نے تحریر پر انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں اس سے ان کی قلبی کیفیات کا اندازہ ہوتا تھا، بعض اوقات جب مستشرقین کی تنقید میں حد سے زیادہ گرمجوشی دکھائی جاتی ہے تو بے اختیار خسرو کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے، جو انھوں نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ؎

اے کہ طعنہ زبت بہ ہندو بری   ہم آموز ازوے پرستش گری

راہِ عمل یہ ساری گفتگو بے معنی رہے گی اگر اس سوال پر غور نہ کیا جائے کہ آیندہ کے لیے راہِ عمل کیا ہونی چاہیے؟ محض مستشرقین کی تنقید کو مقصد بنالینا، یا ان کی علمی بددیانتیوں پر نوحہ کرتے رہنا قوائے ذہنی کے اضمحلال کی نشانی ہے۔

(۱) سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ علوم اسلامی پر تحقیق کے نہایت اعلیٰ مرکز قائم کیے جائیں، اور دنیا کے ہر گوشے سے جدید سائنسی سہولتوں کو کام میں لاکر اسلامی علوم و فنون کے تمام ماخذ ان مرکزوں میں جمع کر دیے جائیں، اس منصوبہ کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ملک پہلے خود اپنے علمی سرمایہ کا جائزہ لے اور جس طرح مولانا سید عبد الحیٔ مرحوم نے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند میں ہندوستان کے علمی سرمایہ کا جائزہ لیا ہے، اسی طرح کے کام ہر ملک میں شروع کیے جائیں، بروکلمان

---

[1] روزگار فقیر، ص ۴۲۔

اور اسٹوری کی کوششیں چراغِ راہ کا کام دے سکتی ہیں، لیکن منزل نہیں بن سکتیں، ماخذ کے سلسلہ میں یورپ کی محتاجگی ختم ہونے کے بعد خود اعتمادی کا جو دور شروع ہوگا وہ علمی جد و جہد میں نئی توانائی پیدا کر دے گا۔

(۲) گو یورپ نے اب تک حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، جغرافیہ وغیرہ کے لاتعداد ماخذ شائع کیے ہیں، لیکن ابھی عربی، فارسی، ترکی زبانوں میں، اسلامی تاریخ کے ایسے منابع موجود ہیں جن کی اشاعت سے تحقیق کی گذرگاہیں روشن ہو سکتی ہیں، اس کام کو بلا تاخیر شروع کر دینا چاہیے۔

(۳) اسلامی تاریخ، مذہب اور تمدن کے متعلق ایسی Encyclopaedias تیار کی جانی چاہئیں جن کی معلومات معتبر اور نقطۂ نگاہ معروضی ہو اور جن سے ان تمام غلط نظریات کی اصلاح ہو سکے جو مختلف طریقوں سے پھیلائے گئے ہیں،

جب Encyclopaedia of Islam کے دوسرے ایڈیشن کا کام شروع ہوا تھا تو کچھ مسلمان فاضلوں نے اس کو یہودی مستشرقین کی منظم سازش سے تعبیر کیا تھا، لیکن وہ کام اپنی تکمیل کو پہنچنے والا ہے، اور مسلمان اپنی کوئی ایسی اسکیم اب تک بروئے کار نہ لا سکے اس سے بھی بڑھ کر افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض مسلمان ممالک اسی انسائیکلو پیڈیا کو اپنی اپنی زبانوں میں منتقل کرکے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھوں نے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے، حال ہی میں Prof. Mircea Eliade کی نگرانی میں ایک بڑا منصوبہ چودہ[۱۴] جلدوں میں Encyclopaedia of Religion تیار کرنے کا بنایا گیا ہے، کیا مسلمانوں کیلئے اس طرح کے منصوبے تیار کرنے اور بروئے کار لانے کا وقت ابھی نہیں آیا؟ ڈاکٹر ذکی ولیدی طوغان نے مستشرقین کے غلط افکار و نظریات کی اصلاح کے لیے ترکوں کی تاریخ اور تمدن پر ایک بسیط کام کا خاکہ تیار کیا تھا، لیکن ڈاکٹر طوغان کی وفات کے بعد معلوم نہیں اس منصوبے کا کیا حشر ہوا، ایران نے Encyclopaedia Parsica کا منصوبہ تیار کیا ہے اور ہر چند کہ احسان یار شاطر کی نگرانی میں

یہ کام ہو رہا ہے، لیکن حقیقی باگ ڈور ابھی مستشرقین ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس جسارت کا مقصد غلط نہ سمجھا جائے تو ان Encyclopaedias سے اپنے ذاتی تعلق اور معلومات کی بنا پر عرض کروں کہ جو عزم، لگن، جذبہ اور عالمانہ تیز نگاہی ان مستشرقین میں نظر آتی ہے اس کا عشر عشیر بھی مسلمان فاضلوں میں نظر نہیں آتا۔

آج سائنس کے انقلابی انکشافات اور ترقیوں نے زمان و مکان کی پہنائیاں ختم کر دی ہیں، اور فکر و نظر کے نئے سانچے وجود میں آ رہے ہیں، بعض کام جدید سائنسی نظریات اور تجربات سے باخبر ہوئے بغیر انجام نہیں دیئے جا سکتے، اقبال نے صحیح کہا تھا: "اسلامی ثقافت کے مورخ کی مشکل زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ عربی کے ایسے علماء تقریباً مفقود ہیں جو سائنس کے مخصوص شعبہ جات کے تربیت یافتہ ہوں[1]"۔ اس لیے ضروری ہے کہ قدیم اور جدید علوم کے ماہرین ایک جگہ جمع ہوں اور اس کمی کو پورا کریں، ہر عہد ایک نئے علم کلام کا مطالبہ کرتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جب کہ انسان وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ پ۱۴ (اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا) کی منشائے الٰہی کو پورا کرتا ہوا نظر آ رہا ہے، نیا علم کلام سائنس کو نظر انداز نہیں کرے گا، ایک زمانہ تھا جب مسلمان متکلمین اور علماء نے (جن میں سر سید کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے) مذہب کو سائنس کے نظریات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، پھر ایک دور آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد نے اعلان کیا کہ سائنس اور مذہب کی راہیں مختلف ہیں اور مذہب کو سائنس کے مطابق ثابت کرنا غیر ضروری ہے، لیکن آج وہ زمانہ آیا ہے کہ سائنس خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں مذہب کے بنیادی نظریات کی تائید کرتا ہوں، وقت اور حالات کا یہ انقلاب عظیم الشان ہے، ضرورت ہے کہ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے، اگر اس بنیادی ضرورت سے بے اعتنائی برتی گئی تو

---

[1] روز گار فقیر

ہماری کوششوں کا حال یہ ہوگا کہ ع خوب است و خوش است و بو ندارد۔

بعض دینی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہوگیا ہے، قرآن کے Semantics مطالعہ کو [illegible] کے ہاتھ سے لے کر آگے بڑھانا چاہیے اور حدیث کے مطالعہ میں Goldziher اور Wensinck کے خطوط پہ تحقیق و ترتیب کی نئی راہیں تلاش کرنی چاہئیں۔ علمائے اسلام نے علوم قرآن اور علم حدیث سے متعلق جو کام کیے ہیں وہ بلا شبہ بہتر بالشان ہیں لیکن ضرورت ہے کہ ان کو آگے بڑھایا جائے۔ وقت کا ایک اور اہم تقاضا یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی کتابوں کی ترتیب موجودہ دور کی ضروریات اور مزاج کے مطابق ہو تاکہ اسلامی نظام حیات کے افادی پہلو سامنے آ سکیں، آج جب کہ یورپ اور امریکہ میں اسلام سے بحیثیت دین غیر معمولی دلچسپی کا اظہار عوام میں ہو رہا ہے، اس کام کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔ اس طرح نہ صرف میکڈانلڈ، شاخت، اینڈرسن وغیرہ کے نظریات کی اصلاح ممکن ہو جائے گی بلکہ اسلام کے نظام حیات اور اسرار دین کے متعلق سوچنے کے نئے پہلو بھی آشکارا ہو جائیں گے، ڈاکٹر اقبال کی دوربین نگاہ نے اس کام کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ آج سے پینتالیس سال قبل لگا لیا تھا اور وہ خود مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کی مدد سے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے مذاق کے مطابق پیش کرنا چاہتے تھے، اس کام کو اب ادنیٰ ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔

اس ساری جد و جہد میں آب و رنگ اسی وقت پیدا ہوگا جب علمی جذبہ سے سرشار مسلمان علماء اور فضلاء علم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ کر اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے خون جگر سے اس کے خاکے میں رنگ بھریں گے، فاضل محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان علماء ایسی تصانیف تیار کریں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت (originality) مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی، ماخذ کے استناد و صحت اور محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق اور ممتاز ہوں[1]!

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

---

[1] اسلام اور مستشرقین، ص ۲۷۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ
کا
نظریۂ سیاست

از

جناب سید محی الدین اظہر، لکچرر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کے والد سلطان سید ابراہیم[1] اپنے عہد کے مشہور صوفی بزرگ سید محمود نوربخشی[2] کی اولاد میں تھے، اور ان کی والدہ سیدہ خدیجہ بیگم کا سلسلۂ نسب خواجہ احمد یسوی[3] سے ملتا ہے، دو تین صاحبزادیوں کے بعد جب حضرت سید اشرف کی پیدائش ہوئی تو خدا رسیدہ والدین[4] نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی، وہ پیدائشی طور پر ہی بہت ذہین واقع ہوئے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سات برس کی کمسنی میں قراءت سبعہ کے ساتھ حافظ قرآن ہوگئے، اور چودہ سال کی عمر کو پہونچتے پہونچتے انھوں نے علوم متداولہ میں وہ کمال حاصل کیا کہ سمنان اور اس کے اطراف کے علماء ان سے رشک کرنے لگے، لیکن تحصیل علم سے فارغ ہوئے ابھی ایک سال ہی

---

[1] لطائف اشرفی (مطبوعہ)، ج ۲ ص ۹۰ - ۹۱ - [2] سید محمود نوربخشی، اسماعیل سامانی (متوفی ۲۹۵ھ) کے ہمعصر تھے اور ان ہی کی دعا سے اسماعیل نے بادشاہت کی جنگ میں اپنے بھائی محمود پر فتح پائی تھی، خاتمہ مکتوبات اشرفی (مخطوطہ) آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی۔ [3] خواجہ احمد یسوی، خواجہ یوسف ہمدانی کے چار جلیل القدر خلفاء میں سے تھے، وہ تبلیغ اسلام کے لیے ترکستان گئے اور وہاں انھوں نے ننانوے ہزار مشائخ کی پیشوائی کی اور ۵۶۲ھ میں "یسہ" میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ لطائف ج ۱، ص ۳۰۶۔

گذرا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور پندرہ[1] سال کی عمر میں ان کو بادشاہت کا تاج پہنا کر تختِ سمنان پر بٹھا دیا گیا[1]۔

بچپن ہی سے ان کے مزاج میں چونکہ فقر و استغناء رچ بس گیا تھا اس لیے بادشاہ ہونے کے باوجود دربارشاہی کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان کے دل کو نہ لبھا سکیں، جب کبھی وہ کسی درویش کی خبر سنتے تو اس کی خدمت میں حاضر ہو کر سلوک کی بابت دریافت کرتے، جب بادشاہت کرتے ہوئے دس سال کا عرصہ گذر گیا تو اپنے چھوٹے بھائی سلطان سید محمد کے سر پر سمنان کی بادشاہت کا تاج رکھ کر راہِ خدا میں اٹھ کھڑے ہوئے، والدہ کی خدمت میں اجازت کے لیے حاضر ہوئے، جنھوں نے ہنسی خوشی اپنے لختِ جگر کو اس سفر کی اجازت دے دی، دو سال کی مسافت طے کر کے جب وہ بنگال میں پنڈوہ شریف کی سرحد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضرت شیخ علاء الدین گنج نبات شہر سے ایک کوس باہر آکر ایک سنبھل کے درخت کے نیچے محفہ[2] لیے ہوئے ان کے استقبال کو کھڑے ہیں، یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے لیے ظاہری طور پر اگرچہ اجنبی تھے، لیکن جذبِ دل نے ایسا جوش مارا کہ شیخ ان کی طرف کمال محبت سے چند قدم آگے بڑھے اور ادھر حضرت سید اشرف بھی دوڑتے ہوئے ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا، شیخ گنج نباتؒ نے جو مریدوں کی تربیت کے معاملہ میں بہت سختی سے کام لیتے تھے، ان کے مسلسل اصرار کے باوجود انھیں کسی خاص خدمت پر مامور نہیں کیا، اور صرف ذکر و فکر کی تاکید کرتے رہے[3]۔

شیخ علاء الدین گنج نباتؒ کی خدمت میں رہ کر سلوک کے منازل و مدارج طے کرتے ہوئے جب چھ سال کا عرصہ گذر گیا تو جونپور کا سفر کیا اور اس مقام کی جستجو شروع کی جس کا نقشہ شیخ نے

---

[1] لطائف ج ۲، ص ۹۳ [2] یہ ایک سواری ہے جسے بنگالی میں "سنگھاسن" کہتے ہیں، لطائف ج ۲ ص ۹۶ [3] لطائف ج ۲، ص ۹۶ - ۹۸۔

ان کو پنڈوہ سے رخصت کرتے وقت بذریعہ کشف دکھایا تھا اور جو آج کل درگاہ کچھوچھہ شریف کے نام سے موسوم ہے۔[1]

کچھوچھہ شریف (پہلے جونپور میں تھا اور اب ضلع فیض آباد میں ہے) آکر اپنی خانقاہ قائم کی اور پھر یہاں سے دو مرتبہ بیرونِ ہند کا سفر کیا، جس کا مقصد اولیاء و مشائخ کے مزارات مقدسہ پر حاضری، حرمین شریفین کی زیارت، معاصر علماء و صوفیہ سے ملاقات و استفادہ، اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور راہِ راست سے بہکے ہوئے مسلمانوں کی رشد و ہدایت تھا، جن ہمعصر علماء و فضلاء اور صوفیہ و مشائخ سے ان کی ملاقات ہوئی، ان میں بعض سے انھوں نے خود استفادہ کیا، اور بعض لوگوں نے ان سے بھی سلوک میں رہنمائی حاصل کی، وہ جس شان و شوکت سے سفر کرتے تھے وہ بعض لوگوں کو اگرچہ پسند نہ تھی،

[1] حضرت سید اشرفؒ کا مزار مبارک جس موضع میں ہے، اس کا نام آج کل "رسول پور" ہے۔ درگاہ شریف کا علاقہ غالباً اس وقت بے نام اور محض جوگیوں کا مسکن تھا، اور یہاں گرہست لوگوں کی آبادی نہ تھی، جہاں آج مزار شریف ہے، وہاں اس وقت ایک ٹیلہ تھا اور ٹیلے سے متصل ایک تالاب بھی تھا، لطائف میں اس تالاب کو "کول" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

لطائف میں مذکور ہے کہ حضرت سید اشرفؒ نے جب دوسری مرتبہ جونپور کا سفر کیا تو کچھوچھہ تشریف لے گئے، اور اس وقت اس علاقہ کا بادشاہ ابراہیم شاہ شرقی تھا،[2] ۸۰۴ھ یا ۸۰۵ھ کے بعد کا یہ واقعہ ہے، لیکن لطائف کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے حضرت سید اشرفؒ کے کچھوچھہ تشریف لے جانے کے واقعہ کے بیان کی ترتیب مشتبہ معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ مرشد کے حکم سے پنڈوہ سے رخصت ہو کر وہ اسی جگہ کو اپنا صدر مقام بنانے کے لیے چلے تھے، اسی بنا پر قیاس چاہتا ہے کہ وہ جونپور کے دوسرے سفر میں نہیں بلکہ پہلے ہی سفر میں کچھوچھہ آ چکے تھے، شیخ گنج نبات نے جن الفاظ میں جائے مقررہ کی نشاندہی فرمائی تھی، وہ ہیں:

"میان آں تال کہ دائرہ وار بر آمدہ است نقطۂ تل دیدہ می شود منزل خاک تو آنجا باشد۔" (لطائف ج ۲ ص ۱۰۶)

مگر جہاں وہ پہونچ جاتے لوگ جوق در جوق قدم بوسی کو آتے اور دولت ایمان سے مالا مال ہو کر لوٹتے اور جب تک اس جگہ سے کوچ نہ کر جاتے، مریدوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔

حضرت سید اشرفؒ کی شخصیت بادشاہی اور فقیری کا حسین ترین امتزاج تھی اور اسی وجہ سے وہ فقراء و مشائخ کے لیے بادشاہوں اور امراء سے میل جول رکھنے کو مناسب سمجھتے تھے، ان کے خیال میں عوام میں یہ بات غلط مشہور ہو گئی ہے کہ فقراء کو اہل دول سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے، ان کے نزدیک اگر کوئی درویش کسی بادشاہ سے اس لیے نہیں ملتا کہ وہ زہد و تقویٰ کے معاملہ میں اس کو کمتر سمجھتا ہے تو اس کا یہ خیال جہالت اور غرور پر مبنی ہو گا، کیونکہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھنا ابلیس کی سنت ہے، اور ایسا ہونے سے لوگ نیکی کی طرف مائل ہونے کے بجائے اور بھی بہک جاتے ہیں، اگر کوئی درویش کسی بادشاہ یا امیر کو خود سے بہتر تصور کر کے اس سے ملے تو یہ عمل اس کو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف لے جاتا ہے، جب نہ نیکو کاروں کی نیکیاں گنہگاروں کے فرد اعمال میں لکھی جاتی ہیں اور نہ بدکاروں کے گناہ نیکوں کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے ہیں تو بادشاہوں اور امراء کے مراتب دینی کا تنزل اور عبادت میں ان کی کوتاہی کسی صوفیِ کامل کے مشرب کو نقصان نہیں پہونچا سکتی[1] چنانچہ حضرت سید اشرفؒ نے اپنی اس رائے کی حمایت میں جو دلیلیں پیش کی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) صوفیوں کا بادشاہوں سے پرہیز کرنا انھیں اپنے سے کمتر سمجھنا ہے، اس میں خودستائی کی بو آتی ہے اور یہ نفس امّارہ کے غلبہ کی دلیل ہے۔[2]

(۲) بادشاہ عادل ہو گا یا ظالم، اگر وہ عادل ہے تو اس سے ملنا عین سعادت ہے،[3] کیونکہ عادل بادشاہ کے بارے میں حسب ذیل احادیث قدسی وارد ہیں۔

(الف) عادل بادشاہ سے ملاقات کے وقت بادشاہ اور اس سے ملنے والے پر خدا اپنی

[1] لطایف ج ۲، ص ۱۰۸، [2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

رحمتوں کی بارش کرتا ہے۔[1]

(ب) قیامت کے دن عادل بادشاہوں کو اللہ کی بہترین مخلوق میں جگہ دی جائے گی۔[2]

(ج) ایک ساعت کا عدل ستر برس کی عبادت سے بہتر ہے۔[3]

حضرت سید اشرفؒ نے اپنی رائے کو مزید باوزن بنانے کے لیے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عادل بادشاہ کا وجود ابر باراں سے بہتر ہے۔[4]

اگر بادشاہ عادل اور دیندار ہے تو اس کے واسطے دعا گو ہونا اور اس کی مدح کرنا عام خلائق پر لازم ہے اور اگر وہ ظالم اور فاسق و فاجر ہے، تو اس کو امور خیر، دینداری، زہد و تقویٰ اور عدل و انصاف کی تلقین کرنے کے لیے علماء و مشایخ کا اس سے ملنا فرض ہے، مگر نصیحت کرتے وقت بادشاہوں اور امراء کے مراتب کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے، کیونکہ اگر باحسن وجوہ اصلاح نہ کی گئی، تو ان کی طبیعت کو گرانی محسوس ہوگی اور اس کا اثر الٹا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب پروردگار عالم نے فراعنۂ مصر کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ کے واسطے بھیجا تو ان کو یہ حکم دیا کہ فرعون سے نرمی سے بات کرو۔[5]

حضرت سید اشرفؒ کے اسی نظریۂ تصوف کا یہ کرشمہ تھا کہ وہ عام صوفیہ کی طرح خانقاہ میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھے نہیں رہے، بلکہ اسلام اور اس کے عقائد و نظریات کی تبلیغ کی غرض سے زندگی بھر سفر کرتے رہے، یوں تو بہت سے امراء و روٴسا ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور ان کی معیت اختیار کر کے راہِ سلوک میں اعلیٰ مقام تک پہونچے، لیکن بادشاہ جون پور ابراہیم شاہ شرقی اور بادشاہِ مالوہ

---

[1] عند ملاقاة الملوك تتنزل الرحمة، لطایف ج ۲، ص ۱۰۸۔ [2] ان افضل عباد اللہ عند اللہ منزلة یوم القیامة امام عادل ورفیق کامل، لطائف ج ۲، ص ۱۰۹۔

[3] عدل ساعة خیر من عبادة ستین سنة، لطایف ج ۲، ص ۱۰۹ [4] سلطان عادل خیر من مطر، لطایف ج ۲، ص ۱۰۹ [5] لطایف ج ۲، ص ۱۰۹۔

ہوشنگ خاں غوریؒ کے نام لکھے گئے خطوط[1] سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ہمہ گیر شخصیت نے ہندوستان کے ان دو نامور حکمرانوں کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ انتظامِ حکومت کے معاملات میں بھی ان سے مشورے کے خواہشمند ہوتے تھے۔

حضرت سید اشرفؒ نے اپنے ایک مکتوب[2] میں ہوشنگ خان کے اس خط کے جواب میں جو انھیں اپنی رسم تاج پوشی کے موقع پر انھیں لکھا تھا اس کو طویل نصیحتیں کی ہیں اور عدل و انصاف کی اہمیت اور بادشاہ کے فرائض سے آگاہ کیا ہے، اس خط کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں انھوں نے سمنان کی بادشاہت کے زمانہ میں حاصل کیے ہوئے اپنے تمام تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے، یہ تحریر ان کی حرکی اور فعّال شخصیت کا ایک ایسا اہم ثبوت ہے جس کی روشنی میں یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ تاریخ صوفیہ میں غالباً وہ واحد شخص ہیں جو علوم شریعت و طریقت میں غیر معمولی مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ وزراء اور رعایا کے ساتھ بادشاہ کے تعلقات کی نوعیت، حکومت کے نظم و نسق اور ملکی و غیر ملکی سیاست پر ایک تجربہ کار سیاست داں اور انسانی نفسیات کے ایک عظیم ماہر کی حیثیت سے بڑی بلیغ نظر رکھتے تھے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سطور ذیل میں متذکرۂ بالا مکتوب سے چند اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا جائے تاکہ ان کا نظریۂ سیاست واضح ہو سکے اور ان کی ہمہ جہت اور تہہ دار شخصیت اور بھی کھل کر سامنے آسکے۔

حضرت سید اشرفؒ سب سے پہلے بادشاہت کے حصول پر اس نعمت کی شکر گذاری کی تلقین

---

[1] ہوشنگ خاں (متوفی ۸۲۵ھ) کا اصلی نام الپ خاں تھا، اس نے تخت نشینی کے بعد ہوشنگ خاں لقب اختیار کیا، اس کا دارالخلافہ 'مانڈو' تھا، ملاحظہ ہو، مانڈو، شادی آباد از غلام یزدانی (اردو ترجمہ از مرزا محمد بشیر) مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۴۲ء ص ۹ [2] ملاحظہ ہو مکتوب بیست و سوم، بیست و چہارم، بیست و ہشتم و بیست چہل و ششم۔ مکتوبات اشرفی (مخطوطہ) مرتبہ سید عبدالرزاق نورالعین، سبحان اللہ کلکشن آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

[3] مکتوب بیست و ہشتم علی گڑھ

کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اس نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تاکہ نعمت اور شوکت میں اور زیادتی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم شکر ادا کروگے تو ہم تمھیں اور زیادہ دیں گے، سلطنت پانے کا شکریہ قیامِ عدل و انصاف ہے[1]"

وزیرِ جنگ، سپہ سالار اور لشکر و افواج کے تعلقات آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح کے ہونا چاہئیں، ملاحظہ ہو:

"وزیرِ جنگ عاقل اور روشن رائے ہو اور فوج اس کی فرماں بردار ہو اور اس کے حکم کے دائرے کے اندر نقطے کی طرح اپنی جگہ پہ ہو[2]۔"

وزیرِ جنگ کو جن جن برائیوں سے بچنا چاہیے ان کا اجمالی بیان اس طرح ہوا ہے:

"وہ امیر جو قوم کا پیشوا ہو اور لشکر کا سپہ سالار جس کا مطیع ہو، یعنی وزیرِ جنگ، اس کو چاہیے کہ نفسانی خواہشات سے خود کو دور رکھے اور حرام مشروب سے بچے، کیونکہ شراب عقل کو زائل اور رائے روشن اور فکر صائب کو برباد کردینے والی ہے، کاموں میں شراب سے سستی پیدا ہوتی ہے، شرابی آج کے ہزاروں کام کل پہ چھوڑ دیتا ہے[3]۔"

[1] "شکرانۂ ایں نعمت بجاے باید آورد تا موجب ازدیاد نعمت شود و سبب مزید شوکت گردد، کما قال اللہ تعالیٰ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ، شکرانۂ دولت عدالت بود۔" [2] "در کارزار امیری باید صاحب رائے و در پیکار وزیری شاید ثاقب آراے، لشکر مبارزان میدان ہمت و عسکر لشکران معرکۂ جلادت تابع او باشند از دائرۂ حکمِ او چوں نقطہ بیرون نہ روند۔" [3] "امیرے کہ پیشواے قوم باشد و سر لشکر اسلام خلق مطیع وے باشد باید کہ او راہ از لذائذ و شہوات نفسانی بستہ دارد و بشرب مناہی اقدام نہ نماید چہ شراب مزیل عقل است و راے ثاقب و فکر صائب و کسالت و اہمال در افعال از نتیجۂ شراب و ہر کیفیت کہ مقتضی بایں معنی بود، او ہزار کار امروز بفردا افگند۔"

رعایا پر ظلم کرنے سے جو خوفناک نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا اجمالی بیان یہ ہے:

"رعایا ظلم سے متنفر اور شکستہ دل ہو جاتی ہے اور تعمیر و زراعت میں مشغول نہیں رہ پاتی، مال میں کمی ہونے لگتی ہے اور رعایا بدحال ہو جاتی ہے، ملک میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، لشکری بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور حکم سے سرتابی کرتے ہیں[1]۔"

ملکی نظم و سیاست اور سفارتی تعلقات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

"وزرا اور ارکانِ دولت کو دوسری سلطنت کے امرا و سلاطین سے پہلے باریابی دینی چاہیے تاکہ وہ فوجیوں کی ضرورت اور مطالبات کو خلوت میں پیش کرسکیں اور انھیں ایسا جواب دینا چاہیے جس سے ان کو پورا اطمینان ہو، اس کے بعد دوسرے ملکوں کے امرا و سلاطین کو ملنے کا موقع دیا جائے اور ان کے مرتبہ کا خیال رکھا جائے اور ان کے رتبہ کے مطابق ان کے اعزاز میں کمی نہ کی جائے[2]۔"

حضرت سید اشرفؒ کے عہد میں ہندوستان کے بیشتر علاقوں کے بادشاہ مسلمان تھے، اور رعایا کی اکثریت غیر مسلم تھی، یہ بات وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ مذہب کا جوش اور ہم مذہبوں کی حمایت کا جذبہ بعض اوقات ایک مذہب کے بادشاہ کو دوسرے مذہب کی رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کرنے میں مانع ہوتا ہے، مگر چونکہ وہ اسلامی اصول و عقائد کے زبردست مبلغ تھے، اس لیے انھوں نے

[1] "رعایا از ظلم متنفر گردد و شکستہ دل، بعمارت و زراعت اشتغال نتواند نمود، نقصان در اموال ظاہر گردد و رعایا مستاصل گردد، خرابی در مملکت آید، لشکریان کلاہ کج کنند و عنان بیرون آیند۔" [2] "وزرا و ارکان دولت را پیش از امرا و سلاطین سلطنت دیگر بار دہند کہ ایشاں عرایض عساکر منصورہ و عرایض لشکر موفورہ در محل خلوت درمیان نہند و جواب شافی بگیرند، بعد ازاں سلاطین و خواتین را بار دہند و در خورِ حال شان اکرام کنند و از اکرام معہودۂ ہر کسے نقصان نہ کنند۔"

مسلمانوں اور غیر مسلم رعایا کے جھگڑوں کے فیصلے کے وقت بھی انصاف کو قائم رکھنے کی ہدایت ان پرزور الفاظ میں کی ہے:

"سلاطین و امراء کے بعد عام لوگوں کو باریابی کی اجازت ہو، رعایا اور مسلمانوں کے جھگڑوں کا فیصلہ انصاف اور شریعت کے مطابق ہو۔"[1]

بادشاہ کو بڑی احتیاط سے گفتگو کرنی چاہیے، کیونکہ اس کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات اہم ہوتی ہے، اس کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

"ہر شخص سے بے ضرورت کلام نہ کیا جائے، اس لیے کہ سلاطین و امراء کی گفتگو انعام کی خوشخبری ہے اور اکرام کی امید دلاتی ہے، ہر ایک کو خوشخبری دے کر امیدوار بنانا اور اسے وفا نہ کرنا ان بادشاہوں کا طریقہ نہیں ہے جو احسان کے زیور سے آراستہ اور ایمان کے نور سے منور ہیں۔"[2]

ارکان دولت کے تقرر اور عہدوں کی تقسیم میں ذاتی لیاقت اور انفرادی استطاعت کا خیال رکھنا ضروری ہے، ملاحظہ ہو:

"وکالت ایسے شخص کے سپرد ہو جو تیز فہم اور حاضر جواب ہو، جہانداری اور شہریاری مناصب کی نہ ہو[؟] ایک کا کام دوسرے کے سپرد نہ کیا جائے۔"

مندرجۂ ذیل اقتباس میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے حکومت و سیاست کا وہ اسلامی نظریہ

---

[1] بعد از خوانین و امراء بار عام دہند تا تقاضا دی و منادی و عوارض رعایا و مسلمانان بعرض رسانیده ہر یک را بقدر عدالت و برنہج شریعت حکم آں بواجبی بجائے آرند۔ [2] و تکلم بے ضرورت بہر کسے نکنند چہ تکلم سلاطین روزگار و ترنم خوانین نامدار نوید است از انعام و امید از اکرام، پس ہر کسے را نوید دادن و امیدوار ساختن و بہ آں وفا ناکردن شعار ملوک متحلی باحسان نبود و نہ شان متحلی با یمان نباشد۔

پیش کیا ہے، جس کی رو سے زمین و آسمان کا حقیقی بادشاہ صرف اور صرف خالق کائنات ہے، اور دنیاوی بادشاہ دراصل روئے زمین پر اس کے ایک ایسے نائب کی حیثیت سے ہیں، جن کا فرض یہ ہے کہ وہ ظالموں کی چیرہ دستیوں سے عوام اور کمزور بندگان خدا کی حفاظت کریں اور سلطنت کے مال و دولت کو رعایا کی فلاح و بہبود میں لگا دیں، ملاحظہ ہو:

"بادشاہوں کا مال راہ خدا میں محتاجوں پر صرف کرنے اور ان کی جان معرفت و حقائق سے آگاہی کے لیے ہے، جتنا جلد بادشاہ اپنے جان و مال کو راہ حق میں لگا دیں اتنا ہی بہتر ہے، اور عمر و مال کا جو حصہ راہ حق میں خرچ ہو وہی کارآمد ہے۔"[1]

حضرت سید اشرفؒ یہ جانتے تھے کہ سلطنت کے انتظامی امور میں وزیر (جس کی شخصیت بادشاہ کے بعد سب سے اہم ہوتی ہے) کلیدی رول ادا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کی ذرا سی غفلت سے اکثر وزیروں نے تخت پر قبضہ کر لیا ہے، اس لیے وہ وزیر کے لیے دیندار اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہونا ضروری سمجھتے تھے، تاکہ اگر کبھی وہ لشکر کے ساتھ سازش کر کے بادشاہ کو معزول کر دینا اور خود تخت پر قابض ہو جانا چاہے تو دینداری اس کے ارادے کو روبہ عمل لانے میں مانع ہو سکے۔

"وزیر کو سارے علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے ساتھ دیندار ہونا چاہیے، سلطنت کے امور میں حشم و خزائن بھی وزیر کے محتاج ہیں، اس لیے اگر وزیر سلطنت پر قبضہ کرنے کا خیال کرے تو دینداری مانع ہوگی۔"[2]

---

[1] "اموال ایشاں برائے صرف محتاجان بود و در راہ خدا تعالیٰ و جان ایشاں در پرداز فضائے حقائق و طیران صحرائے دقائق باشد کہ ہر چہ زود در راہ حق فنا کنند ہماں در کار آید۔" [2] "وزیرے کہ بہمہ فنون آراستہ و بجمیع ہنر پیراستہ بود، بتخصیص دیندار باید چہ وزیر در ہمہ امور سلطنت از حشم و خزائن و ارکان دولت ہمہ بوے محتاج اند، چوں خواہد کہ بر سلطنت تسلط یابد مانع گردد۔"

بادشاہت دراصل مطلق العنانی اور آمرانہ طرز کی حکومت ہے، جس میں عوام کے احساسات وجذبات اور ان کی خواہشات وضروریات کو لحوظ نہیں رکھا جاتا، اس شخصی طرز حکومت میں صرف ایک ہی شخص کی نمایش ہوتی ہے اور اس کی زبان سے نکلا ہوا حرف فرمان کا درجہ رکھتا ہے، کوئی شخص خواہ کیسا ہی عبقری ہو، مگر کبھی کبھی اس سے بھی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی، تاریخ شاہد ہے کہ صرف اپنی ذاتی رائے پر اصرار کرنے اور دوسروں کے مشوروں کو حقیر سمجھکر رد کر دینے کی وجہ سے بڑے بڑے فرماں رواؤں نے نہ صرف سلطنت وحکومت کھوئی بلکہ اپنی جانیں بھی گنوائیں، حضرت سید اشرفؒ نے اسی خطرے کے پیش نظر حسب ذیل اقتباس میں ہوشنگ خان کو وزراء اور ارکان دولت سے مشورے کی ہدایت کی تھی:

"حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت، رسالت، فکر ورائے کے باوجود ان کو امور میں مشورے کا حکم دیا گیا تھا..... آپ کو بھی مشورے سے کام کرنا چاہیے[1]۔"

بادشاہ کے لیے ارکان دولت سے مشورہ لینے اور ایک مجلس مشاورت کے قیام کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لطائف میں ایک جگہ حضرت سید اشرفؒ فرماتے ہیں:

"سلطنت کے امور میں رائے دینے کے لیے ایک مجلس مشاورت ہونی چاہیے جو ملک کے اصحاب رائے اور سربرآوردہ لوگوں پر مشتمل ہو، مشورہ کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ عقلاء کے مشورے سے خیر ظاہر ہو جاتا ہے، کیونکہ عقول انسانی میں فرق ہونا ضروری ہے اور اختلاف رائے سے جو تدبر حاصل ہوتا ہے اس سے ان امور کی عقدہ کشائی ہو جاتی ہے، جہاں تلوار کام نہیں دیتی، اگر رائے کی احتیاج نہ ہو تب بھی عوام کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے سربرآوردہ لوگوں سے رائے

[1] باوجود رائے نبوت آرائے وفکر رسالت افزائے صلی اللہ علیہ وسلم امر شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ شده ..... کار بمشورت کنند۔

لینا ضروری ہے[1]۔"

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مذکورہ بالا ارشادات سے ان کا جو نظریۂ سیاست واضح ہوتا ہے، وہ دنیا میں جمہوری طرز حکومت کی موجودہ شکل کے برعکس ہے، کیونکہ آج کی دنیا میں جمہوریت کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت کو عوام کے منتخب نمایندوں کی اکثریت کے ذریعہ طے شدہ رائے کا پابند ہونا چاہیے، جب کہ حضرت سید اشرفؒ کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے، حاجی نظام یمنی لکھتے ہیں:

"بہت سے عقلاء کا خیال ہے کہ مشاورت میں نقصان ہے، کیونکہ اس سے افشائے راز ہوتا ہے، حالانکہ یہ عین کتمان ہے، اس لیے کہ اختلاف رائے کی موجودگی میں یہ کسی کو نہیں معلوم ہو سکتا کہ بادشاہ کس رائے پر عمل کرے گا[2]۔"

جن چیزوں سے ملک میں فساد برپا ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

"چار چیزوں سے ملک میں فساد ہوتا ہے، اول بادشاہ کی عیش پرستی، دوسرے مقربین کے ساتھ بدخلقی سے پیش آنے اور تیسرے مجرموں کو سزا دینے میں مبالغہ کرنے سے، مثلاً ایک مجرم تازیانہ کا مستحق ہے، لیکن اسے قتل کا حکم دے دیا جائے۔ اور چوتھے رعایا پر مسلسل ظلم سے[3]۔"

اس کے بعد ترجمۂ اردشیر بابکان[4] سے ایک عبارت نقل کی گئی ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

[1] خلاصہ از لطائف ج ۲ ص ۱۶۵ - ۱۶۶ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۶۶ - ۱۶۷ [4] اردشیر بابکان صوبۂ فارس (ایران) میں ایک چھوٹی سی ریاست کا حاکم تھا، اس نے ۲۲۴ء میں اشکانیوں (۲۴۹ قبل مسیح تا ۲۲۶ء) کے خلاف بغاوت کر دی اور تھوڑے ہی دنوں میں ایران کے تمام مشرقی صوبوں پر قابض ہو گیا اور ۲۲۶ء میں اشکانی پایۂ تخت "طیسفون" پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، وہ ۲۴۱ء تک بقید حیات رہا، اس میں جہانبانی وجہانداری کا خداداد ملکہ تھا، اس کے کارناموں سے متعلق ساسانیوں کے آخری عہد میں ایک تاریخ مرتب کی گئی جس کا نام "کارنامک ارتخشتر پاپکان" ہے، اسی کتاب کو موجودہ فارسی میں "اردشیر بابکان" کہتے ہیں، ملاحظہ ہو ہسٹری آف پرشیا از پرسی سائکس ص ۳۹۲، ج ۱، ۳۹۸

"آدمیوں کے بغیر ملک کی کوئی حیثیت نہیں، اور آدمی مال و دولت ہی سے مل سکتے ہیں، مال و دولت ملک کی آبادکاری ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اور آبادکاری عدل و انصاف کے قیام سے ہوتی ہے اور عدل و انصاف کا قیام سیاست سے ہوتا ہے۔[1]"

لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید اشرفؒ کے مریدوں اور معتقدین میں ایسے بہت سے امراء اور رؤسا تھے جنھوں نے دولت و امارت کو چھوڑنا چاہا مگر انھوں نے سختی سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ

"بے علایق روزگار و عوایق کار و بار سلوک پر درگاہ صوفیہ را میسر است، مردانہ باد کہ بجمعیت اسباب و تفرقہ داراب در راہ آیند۔[2]"

ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں:

"اگر بعین بصیرت ملاحظہ کردہ شود ہمہ امرائے روزگار و وزرائے نامدار و برایاے اہل صناعت و حرفت در کار عبادت و سلوک اشتغال دارند۔[3]"

حضرت سید اشرفؒ نے اپنے دامن سے وابستہ تمام صاحبانِ ثروت کی تعلیم و تربیت ان کو دنیاوی معاملات میں مشغول رکھ کر ہی کی، کیونکہ ان کے خیال میں دولت و امارت قربِ حق کی راہ میں ہمیشہ حارج نہیں ہوتیں، وہ جہاں جاتے وہاں علماء و مشائخ کے ساتھ ساتھ صاحب اقتدار لوگوں سے بھی ملتے اور ان کو جادۂ حق پر چلنے اور عدل و انصاف قائم کرنے کی

---

[1] اصل عبارت یہ ہے: "لاملك الّا بالرجال ولا رجال الّا بالمال ولامال الّا بالعمارة ولا عمارة الّا بالعدل ولاعدل الا بالسیاسة"

(لطائف ج ۲، ص ۱۶۶ - ۱۶۷)

[2] لطائف ج ۲، ص ۱۱۳ [3] ایضاً ص ۱۱۴۔

تلقین فرماتے، گویا وہ ایک ایسی حرکی اور فعال شخصیت کے مالک تھے کہ اپنی قوت عمل اور جہد مسلسل سے جہاں ایک طرف عام انسانوں کے دلوں میں ایمان اور زندگی کی حرارت پیدا کرنے کی کوشش کی، وہاں امراء اور بادشاہوں کے دلوں کی دنیا بھی اس انداز سے بدلنے کی سعی کی کہ یہ لوگ اپنا ہر قدم اسلامی ضابطۂ حیات کے مطابق اٹھائیں، اور اپنی اپنی حدود مملکت میں بندگان خدا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھیں، تاکہ ملک آباد اور رعایا خوشحال رہے۔

اسلام اور مستشرقین

پر

دار المصنفین کا بین الاقوامی سیمنار

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۳)

اس سیمنار کے کھلے اجلاس کے بعد رات کو شبلی کالج کے وسیع ہال میں مقالات خوانی کی نشست شروع ہوئی، یہ ہال جناب محمد الاعجاز ندوی کی خوش سلیقگی اور انتھک محنت کی وجہ سے بڑی اچھی طرح سجایا گیا تھا، اس کی زیبائش و آرائش میں ان کی مدد ندوۃ العلماء کے طلبہ نے ہر طرح کی، جو چھوٹے بڑے، ادنیٰ اور اعلیٰ کام کرنے میں اپنی پوری مستعدی کا ثبوت دے رہے تھے، مندوبین ایک بڑے مثلث کی شکل میں بٹھائے گئے تھے، سامعین کے لیے ہر طرف کرسیاں بچھا دی گئی تھیں، شائقین کے ہجوم سے پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لاؤڈ اسپیکر کا انتظام اچھا تھا، اس لیے لوگ باہر بھی کھڑے اور بیٹھے نظر آرہے تھے، مقالات کافی تعداد میں آگئے تھے، اس لیے کھلے اجلاس کے بعد ایک کمیٹی بنا دی گئی تھی کہ مختلف نشستوں میں صدارت اور مقالہ خوانی کی ترتیب دیتی رہے، اس کے ارکان یہ تھے:

(۱) ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق، ڈائرکٹر جنرل رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ (۲) ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی

صدر شعبۂ شریعت وقانون العین یونیورسٹی متحدہ عرب امارات (۳) ڈاکٹر سید سلمان ندوی صدر ثقافت اسلامیہ ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ (۴) ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری پروفیسر تاریخ اسلامی پٹرولیم یونیورسٹی ظہران (۵) جناب مولانا محمد رابع الحسنی ندوی، صدر شعبۂ عربی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۶) مولانا سعید الرحمن الاعظمی الندوی استاذ ادب عربی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۷) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ نئی دہلی (۸) ڈاکٹر مشیر الحق ندوی صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

پہلی نشست کی صدارت جناب ڈاکٹر یوسف القرضاوی ڈین شریعت فیکلٹی قطر یونیورسٹی قطر نے کی جن سے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے پہلو میں بیٹھنے کی درخواست کی گئی، ان کے بائیں جانب ڈاکٹر سید سلمان ندوی بیٹھے جو کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض کو انجام دینے کے لیے بلائے گئے، وہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے صاحبزادے ہیں، ان کو دیکھنے کے لیے لوگ مشتاق رہے، ماشاء اللہ اپنے والد بزرگوار ہی کی طرح شکیل اور وجیہ نظر آرہے تھے، عربی، انگریزی اور اردو بڑی روانی اور متانت کے ساتھ بولتے ہیں جس سے حاضرین متاثر ہوئے، سب سے پہلے ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی صدر شعبۂ شریعت وقانون العین یونیورسٹی متحدہ عرب امارات اپنا مقالہ پیش کرنے کے لیے بلائے گئے۔

ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی ان کے مقالہ کا عنوان "الاسلام انتشر بالسلم لا بالسیف" تھا، وہ زیادہ تر زبانی بڑی رواں اور سلیس عربی میں بولتے رہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا، حالانکہ اس کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ایک فرد واحد نے اس کی تبلیغ شروع کی، جب غار حرا میں وحی نازل ہوئی تو سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ بنت خویلد، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ نے اسلام قبول کیا، ایک مدت تک

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر دعوت دیتے رہے، لوگوں نے اپنی خواہش سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونا پسند کیا، اسلام آگے بڑھتا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں، نہ کہ اسلام قبول کرنے والے دوسروں کو سزائیں دیتے، مسلمانوں پر جو ظلم کیا گیا تو حبشہ کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا، اور پھر مدینہ کی ہجرت ہوئی، جہاں اسلامی مملکت کی بنیاد ڈالی گئی، پھر بھی مسلمانوں کے آلام ومصائب بڑھتے گئے، جس کے بعد یہ حکم نازل ہوا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ

جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا، وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔

(حج: ۳۹)

مسلمانوں پر ظلم وتعدی کا سلسلہ جاری تھا، جس پر ظلم کیا جاتا ہے اس کو حق ہے کہ وہ اپنا دفاع کرے، اسی لیے اس آیت میں ظالموں کے خلاف وسائل کو بروئے کار لانے کی اجازت دی گئی، اسلام کی تبلیغ اور کفار سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں پہلا حکم تو یہ ہے کہ ان کو صلح وآشتی اور حجت ودلیل سے دعوت دی جائے، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو دوسرا حکم یہ ہے کہ ان سے جزیہ طلب کیا جائے، جس سے یہ مراد ہے کہ وہ اگر اسلامی حکومت کی بالادستی قبول کرلیتے ہیں تو پھر وہ ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہیں، اور اگر وہ اس کو بھی قبول نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ دعوت اسلام میں رکاوٹ پیدا کریں گے، جس کے بعد یہ تیسرا حکم ہے کہ ان سے جنگ کی جائے، ان ممالک کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے جہاں اسلام پھیلا۔ ان میں ہندوستان بھی ہے جہاں یہ مسلمانوں کے اخلاق وبرتاؤ سے پھیلتا گیا، مدینہ کے اہل کتاب سے رسول اللہ صلعم نے

امن وسلامتی کا معاہدہ کیا، مگر جب ان لوگوں نے اس کی پابندی کرنے کے بجائے درپردہ دشمنوں کی مدد کی، حتی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے خلاف ناپاک سازش کرنے لگے تو اس کا سدباب کیا گیا، یہ کھلی ہوئی ہدایت ہے کہ جو چاہے اسلام لائے اور جو چاہے اپنے دین پر برقرار رہے، البتہ دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے، اس کو جبراً اسلام قبول کرنے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ

(توبہ: ۲۹)

جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر (یقین رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو خدا اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں، اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ ذلیل ہوکر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

پروفیسر امیر حسن عابدی دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے اپنا مقالہ "پروفیسر ایڈورڈ براؤن اور اسلام" کے عنوان سے پیش کیا، وہ اپنا پورا مقالہ تو پڑھ نہ سکے، اس کے خاص خاص حصے پڑھ کر سنائے، جو یہ ہیں:

فارسی سے پہلے یورپ میں عربی کی ابتدا ہوئی، جس کے ذریعہ سے یونانی فلسفہ خاص کر ارسطو کے خیالات سب سے پہلے مغربی یورپ کو معلوم ہوئے، تیرہویں صدی میں البرٹس میگنس نے فارابی اور ابن سینا کی کتابوں سے اخذ کرکے ارسطو کی تعلیمات کو پیرس میں پیش کیا، اس صدی میں راجر بیکن اور ریمانڈ لل نے مشرقی زبانوں کے حاصل کرنے پر اصرار کیا، جس سے فلسفہ اور سائنس کا

مطالعہ ہو سکے، چودہویں صدی کے شروع میں پانچویں پوپ نے یورپ کے مختلف شہروں میں عربی وغیرہ کی پروفیسرشپ قائم کرائی. مگر اس کا خیال رکھا گیا کہ اس سے عیسائی مذہب کو کوئی نقصان نہ پہونچے، سولہویں صدی کے شروع میں باقاعدہ یورپ میں مشرقی علوم کا چرچا اور رواج ہوا، دنیا پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے یونانی علوم وفنون کو زندہ رکھا، یورپ والے ان ہی عربی ترجموں سے استفادہ کر کے آگے بڑھے ہیں.

یورپ میں عربی اور فارسی وغیرہ جیسے مشرقی علوم کی طرف توجہ کرنے کے دو اسباب تھے، ایک تو یہ کہ ان زبانوں، خاص کر عربی کے ذریعہ سے وہ یونانی علوم کو حاصل کر کے سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کو سمجھ سکیں، دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اسلام، قرآن اور مسلمانوں میں طرح طرح کی خامیاں اور کمزوریاں نکال کر ان پر کیچڑ اچھال سکیں، پھر بھی بہت سے ایسے مستشرقین بھی ہیں جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم وفنون کا مطالعہ بڑی دیانت داری سے کر کے ان سے پورا پورا استفادہ کیا، اور مسلمانوں کے دین کے معترف ہوئے، پروفیسر ایڈورڈ جی. براؤن کا شمار ایسے ہی مستشرقین میں کیا جائے گا، انھوں نے فارسی ادب کی تاریخ لکھنے میں مسلمانوں کی صحیح خدمات کا صحیح جائزہ لیا ہے، جس میں وہ ایک سچے اور ایماندار محقق کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، انھوں نے ابن ہشام، الفخری، دینوری، بلاذری، مسعودی اور یعقوبی وغیرہ کے حوالے سے اپنی تحقیقات کی تکمیل کی ہے، ان کا خیال ہے کہ نوشیروان کی شاندار حکومت (۵۳۱ء ۵۷۸ء) کے زمانہ میں سب سے زیادہ اہم اس کا بیالیسواں سال (۵۷۲-۳ء) ہے جسے عرب عام الفیل کہتے ہیں، اسی سال ایک طرف تو ایران نے یمن کی سلطنت پر فتح پائی، دوسری طرف مکہ معظمہ میں محمدؐ کی ولادت ہوئی جن کی تعلیمات کے نتیجہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، یہاں اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ نوشیروان بڑا جابر، ظالم اور سفاک بادشاہ تھا، اس نے زرتشتی مذہب کے سوا

کسی مذہب وملت کو پنپنے نہیں دیا، سب کا قلع قمع کر دیا، مزدک اپنے زمانہ کے کمیونسٹ تھے، اس نے ۵۲۸ء میں ان کی تحریک کو بھی بالکل کچل دیا، وہ عیسائیوں کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا، مذہب مانی کو بھی کچلا، مگر اس نے زرتشتیوں کا پورا احترام کیا، ان کو ہر طرح کی سہولتیں دیں اس لیے ان کی نظروں میں بڑا مہربان بادشاہ تھا، وہ اسے نوشیروان عادل کے خطاب سے یاد کرتے ہیں جو ہماری روایتوں کا جزبن گیا ہے، براؤن نے نوشیروان کو متشدد اور متعصب بتایا ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کو مامون الرشید اور اکبر جیسے بادشاہوں کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ براؤن ان مسلمان فرماں رواؤں کی عظمت کے معترف تھے.

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے براؤن نے لکھا ہے کہ آپکا کام بہت مشکل تھا، اس لیے کہ ریگستانی عرب دل سے مادی اور خشک ہوتے ہیں، انھیں ماوراء الطبیعیات اور الٰہیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، انھیں ایسے خدا کی بھی ضرورت نہیں جو طاقتور تو ضرور ہے، مگر ان سے خدمت اور نفی ذات کا خواہاں ہے، براؤن کے نزدیک ہجرت (۶۲۲ء) سے لے کر حضرت عمرؓ کی وفات (۶۴۴ء) تک کا زمانہ مقدس اسلام کا زریں عہد ہے، جو فلسفیانہ اسلام سے جدا اور الگ ہے.

براؤن نے ڈوزی کا ایک طویل اقتباس دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ بازنطینی اور ایرانی حکومتوں کی شان وشوکت ایک مثل بن گئی تھی، لیکن لوگ ان کی مطلق العنانیت کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، دونوں شاہی خاندانوں نے دہشت پھیلا رکھی تھی، اور دونوں اپنے مذہبی تعصب کی وجہ سے لوگوں کو ہر طرح کی اذیتیں دے رہے تھے کہ یکایک عرب کے ریگستان سے کچھ نئے لوگ نمودار ہوئے جو پہلے تو بیشمار قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، اور باہمی جنگ وخوں ریزی میں مبتلا تھے، مگر اب سب ایک ہو گئے تھے، وہ آزاد، لباس وغذا میں سادہ، شریف، مہمان نواز اور

سمجھ دار تھے، لیکن اسی کے ساتھ غیور، خوددار، تندمزاج، انتقام پسند، سفاک اور ظالم بھی تھے، دیکھتے دیکھتے بڑی لگی ایرانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، قسطنطنیہ کے جانشینوں سے ان کے اچھے صوبے چھین لیے، ٹیوٹن نسل کی حکومت کو اپنے قدموں سے کچل دیا اور بقیہ یورپ میں دہشت پھیلا دی، دوسری طرف ان کی فاتح فوجیں ہمالیہ میں داخل ہو گئیں، پھر بھی یہ دوسرے فاتحوں کی طرح نہ تھے، اس لیے کہ یہ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے، ایرانیوں کی ثنویت اور بگڑی ہوئی عیسویت کے خلاف انھوں نے ایسی توحید کا اعلان کیا، جس کو لاکھوں آدمیوں نے قبول کیا اور جو آج بھی انسانی آبادی کے دسویں حصہ کا مذہب ہے، براؤن نے ڈوزی کا یہ اقتباس دے کر اس کا ثبوت دیا ہے کہ وہ اس کے خیالات سے بڑی حد تک متفق تھے، گرچہ ڈوزی کے بعض خیال سے مسلمانوں کا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔

براؤن نے پیغمبر اسلامؐ کی زندگی، خلفائے راشدین، حضرت عثمانؓ کی شہادت، حضرت علیؓ کی خلافت اور معاویہؓ کا اس سے انکار، جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں، خوارج، معاویہؓ کے ساتھ صلح، امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری، یزید، معرکۂ کربلا، ابن زبیرؓ اور مختار کی بغاوتوں، عبدالملک کی حکومت۔ حجاج کے مظالم، عمر بن عبدالعزیزؒ، ابن عباسؓ کے پروپیگنڈے، بنی امیہ کے زوال کے اسباب، ابو مسلم خراسانی، عباسی حکومت، برامکہ، نوروز تہوار کے احیاء وغیرہ کا جائزہ تفصیل سے لیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کے ان پہلوؤں پر ان کی نظر اچھی تھی۔

براؤن کے یہاں معتزلہ اور اشاعرہ کی بھی بحث ملے گی، ان کے خیال میں معتزلہ شروع ہی سے یونانی فلسفہ سے متاثر رہے، عباسی خلیفہ متوکل (۸۴۷ء-۸۶۱ء) کے زمانہ میں ان کی سیاسی حیثیت ختم ہو چکی تھی، لیکن ان کے دبستان خیال کی تین سو سال بعد بھی زمخشری جیسے مفسر قرآن نے نمائندگی کی، براؤن نے ابوالحسن اشعریؒ اور ان کے بزرگ ابو موسیٰ اشعریؓ کے بے عقل ہونے کی تائید کی ہے، گو اس رائے سے مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ کو اتفاق نہیں۔

براؤن نے اخوان الصفا جیسی جماعت کو اہمیت دی ہے، جس کے ذریعہ سے ان کے خیال کے مطابق اسلام اور یونانی فلسفہ میں تطبیق ہوئی، براؤن نے زرتشتیوں کے صاحب کتاب ہونے کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے اور اس کا ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب جیسا سلوک کرنے میں جھجک ہو رہی تھی، لیکن عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان سے کہا کہ میں نے پیغمبرؐ سے سنا ہے کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیے جو اہل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔ براؤن نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اس لیے اس کے خلاف ایرانی جذبات کارفرما رہے، اس کے برخلاف ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام حسینؓ کی شادی یزدگرد سوم کی لڑکی شہربانو سے ہوئی، جن سے نو امام عالم وجود میں آئے، اس طرح بقیہ امام حضرت پیغمبرؐ اور ساسانی بادشاہوں کی اولاد سے ہوئے۔ ایران میں حضرت شہربانو بڑے احترام سے دیکھی جاتی ہیں، ان کے نام سے ایک پہاڑ بھی ہے، جس کو کوہ بی بی شہربانو کہا جاتا ہے اور جو تہران سے ۳-۴ میل جنوب میں ہے۔

براؤن کے نزدیک ایران پر عربوں کی فتح سے زیادہ مشکل کام اسلام کا زرتشتی مذہب پر غلبہ حاصل کرنا تھا، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان فاتحوں نے لوگوں کے لیے قرآن اور تلوار کے سوا کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں، البتہ انھیں جزیہ دینا پڑتا تھا، کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زرتشتیوں پر کوئی خاص سختی کی گئی، یا ایران کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، بیشتر تبدیلی مذہب اختیاری تھی، براؤن کی اس رائے سے ان کی رواداری کا اظہار ہوتا ہے۔

براؤن نے بہت سے مسلمان علماء کا ذکر کر کے ان کے تبحر علمی اور دقت نظر کا اعتراف کیا ہے، ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی بھی ہیں جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں: "جہاں تک میں فیصلہ کر سکتا ہوں شروع سے لکھے

سترہویں صدی کے آخر تک ممتاز فارسی شعراء کا بہترین تبصرہ انتہائی بدقسمتی سے اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھی ہوئی شبلی نعمانی جیسے ممتاز عالم کی شعرالعجم ہے، براؤن کی اس رائے سے ہم میں یہ احساس ہونا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں کے کارنامے بہتر سے بہتر شکل میں دنیا کے مستشرقین کے سامنے پیش کیے جانے کی ضرورت ہے، علامہ شبلیؒ کی منتخب تصنیفات اور تالیفات کو دنیا کی زبانوں میں، خاص کر انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ دوسری زبان کے لوگ اس سے پورے طور سے استفادہ کر سکیں۔

یہ مقالہ ختم ہوا تو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے پروفیسر امیر حسن عابدی سے یہ سوال کیا کہ براؤن کا خیال ہے کہ اسلام نے ایران کی صرف اوپری سطح کو چھوا تھا اور جو چیز ایرانیوں کے خون میں شامل تھی کبھی ختم نہیں ہوئی، اس کی ایک شکل عجمی تصوف ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا: الحذر زیں گوسفنداں الحذر۔ کیا آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟ پروفیسر امیر حسن عابدی نے جواب دیا کہ تصوف کی بحث میں اس وقت پڑنا نہیں چاہتا ہوں، کیونکہ میں فارسی کا طالب علم ہوں، اور وہ بھی ادب کا، اسلامیات کا نہیں، اس سیمینار کے لیے میں نے جو مقالہ لکھا ہے اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ لکھنے کے لیے اسلام کا مطالعہ ضروری تھا، براؤن نے اسلام کا مطالعہ جس طرح کیا، وہی میں نے پیش کیا ہے، میرے مقالہ میں تصوف کا ذکر کہیں نہیں ہے، اس لیے تصوف پر براؤن کے خیالات پر بحث کرنا اس وقت مناسب نہیں ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مقالہ "مستشرقین کے انکار و نظریات کے مختلف دور اور اصلاح حال کی راہ" کے عنوان سے تھا جو بڑا پُر مغز اس لیے تھا کہ پوری تحقیق اور امعان نظر سے لکھا گیا تھا، یہ مقالہ معارف کی زیر نظر اشاعت میں چھپ رہا ہے، جس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جا سکتا ہے، اسی کے کچھ حصے حاضرین کو پڑھ کر سنائے گئے، اس میں قابل توجہ وہ حصہ ہے

جس میں مستشرقین سے محاذ آرائی کرنے کے بجائے ایک راہ عمل متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

مستشرقین کی تنقید کو محض مقصد بنا لینا یا ان کی علمی بددیانتیوں کا نوحہ کرتے رہنا قوائے ذہنی کے اضمحلال کی نشانی ہے، سب سے پہلے ضرورت یہ ہے کہ روح اسلامی پر تحقیق کے نہایت اعلیٰ مرکز قائم کیے جائیں اور دنیا کے ہر گوشہ سے جدید سائنسی تجربوں کو کام میں لا کر اسلامی علوم و فنون کے تمام ماخذ ان مرکزوں میں جمع کر دیے جائیں، اس منصوبہ کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ملک پہلے خود اپنے علمی سرمایہ کا جائزہ لے، ماخذ کے سلسلہ میں یورپ کی محتاجی ختم ہونے کے بعد خود اعتمادی کا جو دور شروع ہوگا وہ علمی جدوجہد میں نئی توانائی پیدا کر دے گا۔ یورپ نے اب تک حدیث، فقہ اور جغرافیہ وغیرہ کے لاتعداد ماخذ شائع کیے ہیں، اب ضرورت ہے کہ مسلمان علماء بھی اسی طرح توجہ کریں، وہ اسلامی تاریخ، تہذیب اور تمدن کے متعلق ایسی انسائیکلوپیڈیا تیار کریں جن کی معلومات معتبر اور نقطۂ نگاہ معروضی ہو، اور جن سے ان تمام نظریات کی اصلاح ہو سکے جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام یا ڈکشنری آف اسلام کے ذریعہ پھیلائے گئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک اجلاس میں کہا تھا: یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ قدیم و جدید علوم کے ماہرین ایک جگہ جمع ہوں اور اس کمی کو پورا کریں، پھر ہر عہد ایک نئے علم کلام کا مطالبہ کرتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جب کہ انسان وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ اور اس کے منشائے الٰہی کو پورا کرتا نظر آ رہا ہے تو علم کلام سائنس کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن کے مطالعہ کو آگے بڑھایا جائے، حدیث کے مطالعہ کو بھی گولڈ زیہر کے حدود سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، وقت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ فقہ اسلامی کی کتابوں کی تشریح موجودہ دور کی ضروریات

کے مطابق ہو تاکہ فقہ اسلامی کے افادی پہلو سامنے آسکیں، آج جب کہ یورپ و امریکہ میں اسلام سے بحیثیت دین غیر معمولی دلچسپی لی جا رہی ہے، اس کام کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اس طرح نہ صرف شاخت وغیرہ کے نظریات کی اصلاح ہو جائے گی بلکہ اسلام کے نظامِ حیات کے متعلق سوچنے کے نئے پہلو بھی آشکارا ہو جائیں گے، ڈاکٹر اقبالؒ کی دور بین نگاہ نے اس کام کی اہمیت کا اندازہ آج سے پینسٹھ[۶۵] سال پہلے لگایا تھا، اور وہ مولانا انور شاہ کشمیری کے ذریعہ سے فقہ اسلامی کو عصرِ حاضر کے مذاق کے مطابق پیش کرنا چاہتے تھے، اس کام کو اب اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جا سکتا، اس ساری جد وجہد میں آب و رنگ اس وقت پیدا ہوگا جب علمی جذبہ سے سرشار مسلمان علماء و فضلاء علم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ کر اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے خونِ جگر سے اس خاکے میں رنگ بھریں گے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے مقالہ کو اس شعر پر ختم کیا ؎

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن — قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

تو مجمع میں ایک جھرجھری سی پیدا ہو گئی، یہ مقالہ اپنے وزن اور وقار کی وجہ سے بڑی توجہ اور خاموشی سے سنا گیا، اس پر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا، شاید اس لیے کہ اس میں کوئی متنازع فیہ بات نہیں تھی، یہ ایک علمی، تحقیقی اور تاریخی رنگ کا مقالہ تھا، جس میں قیمتی اور مخلصانہ مشورے بھی تھے اور یہ وہاں دیے جا رہے تھے جہاں علماء کا سنجیدہ طبقہ بھی تھا، ان میں جدید طبقہ کے جذبات کی ترجمانی بھی ہے کہ وہ اس ترقی یافتہ دور میں اپنے ذہنی، قلبی، نظری اور فکری تسکین کے لیے اپنے اربابِ فکر سے کس قسم کی توقع رکھتا ہے، امید کہ یہ آواز جس اخلاص سے اٹھائی گئی ہے، اسی اخلاص سے سنی بھی جائے گی، مگر اسلامی علوم و فنون اور ان کے ماخذوں کی کمی کا احساس بھی زیادہ صحیح نہیں، تیرہ سو[۱۳۰۰] سال کے اندر اسلام اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اگر ان کا مطالعہ

خاطر خواہ طریقہ پر کیا جائے تو ان تمام غلط نظریات کی تردید اور اصلاح ہو جائے جو کسی مقصد کی خاطر پھیلائے گئے ہیں اور اب تو اسلامی ادارے، اسلامی سینٹر اور اسلامی ریسرچ انسٹیٹیوٹ جا بجا اتنے قائم ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہر قسم کا لٹریچر مہیا ہو رہا ہے، ان میں نیا کلامی رنگ بھی ملے گا، صرف ان کو زیادہ سے زیادہ عام کر کے ان میں توانائی اور آب و رنگ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، فقہ اسلامی کی جدید تدوین کے سلسلہ میں بھی کافی لٹریچر مہیا ہو رہا ہے، اس میں اگر باضابطگی اور باقاعدگی پیدا کر دی جائے تو یہ مشکل آسانی سے خود بخود حل ہو جائے، مگر ذہنی تسکین کا مسئلہ کبھی ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے کہ مذہب، مذہب کی اساس اور مذہب کی روح قربان ہو کر رہ جاتی ہے، جیسا کہ آج کل کی مغربی دنیا میں ہو رہا ہے، وہاں مختلف قسم کے نظری اور فکری خیالات کے انبار کے نیچے مذہب بالکل دب کر رہ گیا ہے، رہا مستشرقین کی علمی بددیانتیوں کو ظاہر کرنے میں ذہنی اضمحلال کا سوال، تو اس پر اس زاویۂ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی بظاہر معروضی تحقیقات کا جواب معروضی انداز میں اگر دیا جائے تو یہ علمی اور تحقیقی خدمت بھی ہے، ان مستشرقین پر یہ بھی ظاہر کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ظنیات کو یقینیات کا درجہ دے کر اور اپنے نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات میں سلسلۂ معلولات پیدا کر کے علم اور تحقیق جیسے مقدس اور معصوم فن کو کس قدر مجروح کر رہے ہیں، خود بھی گمراہ ہو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی | مولانا کا مقالہ "پروفیسر اجناس گولڈ زیہر" پر تھا، وہ اس کا کچھ حصہ ہی پڑھ سکے، شروع میں یہ بتایا کہ ان کی ولادت ہنگری کے ایک شہر میں سنہ ۱۸۵۰ء میں ہوئی، پانچ[۵] برس کی عمر میں عہد عتیق کے عبرانی ایڈیشن کا مطالعہ شروع کیا، آٹھ[۸] برس کی عمر میں پوری تلمود پڑھ لی، بارہ[۱۲] برس کی عمر میں عبرانی زبان میں ایک مقالہ لکھا، پھر بوڈاپسٹ، لیپزگ، برلن اور لیڈن میں مزید تعلیم پائی، لیڈن کے قیام میں اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق ان کی علمی زندگی کا

نہایت اہم مشن بن گیا، جامعہ ازہر قاہرہ کے بھی وہ طالب علم رہے، اپنے وطن واپس آکر اسلام کا تحقیقی مطالعہ جاری رکھا، جب ۱۸۷۲ء میں وائنا کی امپیریل اکیڈمی میں ان کے علمی کارنامے کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ، خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے ان کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھنے لگیں، معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر وہ یہودی کمیونٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے مسلسل تیس برس ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ء تک کام کرتے رہے، مگر اپنی علمی تحقیقات بھی جاری رکھیں، ۱۹۰۴ء میں وہ بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں سامی زبانوں اور ان کے ادبیات کے پروفیسر ہوگئے، پھر اسلامی فقہ کے شعبے کے صدر ہوئے، ان کے تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن چند معرکۃ الآرا کتابیں یہ ہیں: (۱) فرقہ ظاہریہ (۲) اسلامیات کا مطالعہ (۳) اسلامی دینیات اور قانون (۴) مذاہب التفسیر الاسلامی میں تفسیر قرآن کے مختلف مناہج سے بڑی محققانہ بحث ہے۔

پھر مولانا نے گولڈزیہر پر جو عام تبصرہ کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے: گولڈزیہر یہودی تھے، ان کے زمانہ میں یہودی خود عیسائیوں کے ستم دیدہ تھے، اور یوں بھی یہودی مذہبی معاملات ومسائل میں اپنے آپ کو عیسائیوں کی بہ نسبت مسلمانوں سے زیادہ قریب سمجھتے تھے، ان وجوہ کے باعث گولڈزیہر نے اسلامیات پر جو کچھ لکھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا لکھا کہ اس میں عبقریت کی شان نظر آتی ہے، اس کے متعلق بدنیتی کا الزام نہیں دیا جاسکتا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ گولڈزیہر نے غلطیاں نہیں کی ہیں، ان کی غلطیاں دو قسم کی ہیں (۱) مستشرقانہ غلطیاں (۲) علمی غلطیاں، مستشرقانہ غلطیوں کے سلسلہ میں ہم کو بنیادی طور پر یہ یاد کر لینا چاہیے کہ کوئی مستشرق خواہ کیسا ہی انصاف پسند اور اسلام کی رفعت وعظمت کا دل وجان سے قائل ہو وہ بہرحال غیر مسلم ہے، اس بنا پر وہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کرتا ہے وہ بے شبہ ایک مسلمان کا نقطۂ نظر

ہرگز نہیں ہوسکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لیے بعض جو بنیادی عقائد لازمہ ہیں اگر مستشرق بھی ان عقائد کا حامل ہو تو وہ غیر مسلم ہی کہاں رہے گا، مثلاً نبوت کا اسلام میں تصور اور اس تصور کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرسل من اللہ ہونا، علاوہ ازیں معراج نبویؐ اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا، یہ اور اسی طرح کی چند اور باتیں ہیں جو مستشرقین عام طور سے تسلیم نہیں کرتے، گولڈزیہر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، دوسری قسم کی غلطیاں جو گولڈزیہر سے ہوئی ہیں وہ علمی غلطیاں یا تعبیر وبیان کی فروگذاشتیں ہیں، لیکن یہ چنداں تعجب انگیز نہیں اور ان سے گولڈزیہر کے بلند مرتبہ ومقام پر حرف آتا ہے، جو انھیں علم وتحقیق کی بارگاہ علمی میں بجا طور پر حاصل ہے، اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں تک ان کی مستشرقانہ غلطیوں اور فروگذاشتوں کا تعلق ہے، مسلمان تو مسلمان، زمانۂ حال کے بعض مستشرقین نے خود ان کا اعتراف کیا ہے اور ان کی طرف سے ان کی معذرت کی ہے، ان کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا" پر برنارڈ لیوس نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ گولڈزیہر اور ان کے ہم عصر مصنفین کو اس کا خیال ہی نہیں تھا کہ ان کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہوں گے، اس لیے یہ لوگ اپنا مخاطب مغرب کے قارئین ہی کو بناتے ہیں، چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈزیہر بھی قرآن کو پیغمبر اسلامؐ کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیص ہے، علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے عام مغربی مصنفین کی طرح گولڈزیہر نے بھی قرآن وحدیث میں عہد جاہلیت اور بعض اجنبی اثرات پر بحث کی ہے، یہ موضوع بھی حساس مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے، اس بحث میں گولڈزیہر نے جو زبان استعمال کی ہے، وہ اب سے ایک سو برس پہلے تو استعمال ہوتی تھی، لیکن مستشرقین اب ایسی زبان استعمال نہیں کرتے جو مسلمانوں کے لیے آزردگی کا سبب ہو، برنارڈ لیوس نے گولڈزیہر کی "انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا" کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانہ کی پیداوار ہے، چند مباحث

اور وہ بھی زیادہ تر تفصیلات و تشریحات کے معاملہ میں گولڈ زیہر کی تحقیقات کو ان نئے معلومات اور دلائل کی روشنی میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے جو گولڈ زیہر کے بعد سے اب تک حاصل ہو چکے ہیں اور جن پر عصر حاضر کی تحقیقات نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، برنارڈ لیوس ان غلطیوں اور فروگذاشتوں کو سامنے لا کر یہ بھی لکھتا ہے کہ گولڈ زیہر نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے کارناموں کے ساتھ جس غیر معمولی ہمدردی کا جا بجا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم ہے، ان کے معاصرین اور پیش رو مصنفین میں سے جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے اور ان میں رد و بدل کر کے اسلام پر اعتراضات کیے تھے، گولڈ زیہر نے ان لوگوں کی پردہ دری کر کے اسلام کی حقانیت، اصلیت اور ان کے استناد کو ثابت کیا، اس سلسلہ میں وہ عیسائیت کے ان علماء کے خلاف بھی سخت احتجاج کرتا ہے جو عیسائیت پر بحث کرتے ہیں تو اپنی یکطرفہ عقلیت پر بھروسہ کر لیتے ہیں، لیکن جب وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کے لیے معیار تنقید بہت سخت اختیار کر لیتے ہیں۔

پروفیسر برنارڈ لیوس نے گولڈ زیہر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ بڑی بات تو یہ ہے کہ عرب علمائے اسلام کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ علمائے عرب نے گولڈ زیہر کی دو کتابوں کے ترجمے "مذاہب التفسیر الاسلامی" اور "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام تاریخ التطور العقدی والتشریعی فی الدین الاسلامی" کے نام سے کیے، اول الذکر ترجمہ قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر عبدالحلیم النجار کا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ قرآن مجید کے درس و مطالعہ کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے اعتبار سے اسلامی ثقافتوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد، منفرد اور ایک بالکل نئے طرز کا کارنامہ ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض دینی عواطف و جذبات کی تشریح میں دوسرے مستشرقین کی طرح گولڈ زیہر سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں، یہ علمی اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے، لیکن گولڈ زیہر کو ایک عالم اور محقق کی

حیثیت سے جو بلند مرتبہ حاصل ہے، اس کو ان غلطیوں سے نقصان نہیں پہونچا، مذکورۂ بالا دوسرا ترجمہ مصر کے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اور پروفیسر عبدالعزیز عبدالحق نے کیا ہے، اس ترجمہ کے مقدمہ میں ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے مستشرقین پر عام تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یورپ کے جن علماء نے اسلام اور مسلمانوں پر کسی حیثیت سے خامہ فرسائی کی ہے ان میں دو طبقے ہیں، ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنی خواہشات کے بندے تھے، اس لیے یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، لیکن ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا جو انصاف پسند تھا، ان لوگوں کو تحقیق و تدقیق کے بعد جو بات حق نظر آئی اسے برملا کہا، گولڈ زیہر کا شمار اسی طبقہ سے ہے، پھر ان کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا" کے بارہ میں لکھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عقیدہ اور شریعت کے نشو و نما اور عہد بہ عہد اس کا ارتقاء، زہد اور تصوف، مختلف اسلامی فرقے، مذہبی تحریکات اور ان کے اسباب و علل، ان سب کا وسیع مطالعہ پیش کرتی ہے، اس کتاب میں انہی مراجع سے کام لیا گیا ہے جو معتبر ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور گہری بصیرت معاون رہی ہے، لیکن اس کتاب میں غلطیاں بھی کم نہیں ہیں، اس کے وجوہ متعدد ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باعث وہ اسلام کے مبادی، اصول اور اصل روح تک پہونچنے سے قاصر رہا۔ اس کے بعد مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بتایا کہ فاضل مترجمین نے ایک طرف تو افادۂ عام کی غرض سے بڑی محنت سے گولڈ زیہر کی کتابوں کو عربی جامہ پہنایا، دوسری طرف اس کی نوع بہ نوع غلطیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح بھی کی آخر میں مولانا نے اپنے سامعین کو مخاطب کر کے کہا کہ جو روش علمائے عرب نے پروفیسر گولڈ زیہر کی نسبت اختیار کی ہے، وہی روش ہمیں گولڈ زیہر جیسے دوسرے مستشرقین کے متعلق اختیار کرنی چاہیئے۔

مولانا تقی الدین کا تبصرہ

جب یہ مقالہ ختم ہوا تو ابوظبی کے نمائندہ مولانا تقی الدین مظاہری ندوی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

حضرت مولانا نے اپنے مقالہ میں گولڈ زیہر کے سلسلہ میں علمائے عرب کے بیانات نقل کرکے ان کو سراہا ہے، مگر مجھے تعجب ہے کہ مولانا کی نگاہ سے عرب علماء میں ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی کی کتاب "السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی" نہیں گذری، اس میں ڈاکٹر صاحب نے گولڈ زیہر کے انکار و نظریات کا پوسٹ مارٹم کیا ہے، میں وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

گولڈ زیہر نے امام زہریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

ان ھؤلاء الامراء اکرھونا	ان امرائے بنی امیہ نے ہمیں ایسی
علی کتابة احادیث	حدیثیں تحریر کرنے پر مجبور کیا۔

اس میں احادیث کے لفظ میں انھوں نے سراسر تحریف سے کام لیا ہے، اور الاحادیث کو احادیث کر دیا ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تدوین حدیث کے لیے امام زہریؒ کو مقرر کیا تو ابتدا میں وہ اس پر راضی نہیں ہوئے، مگر بعد میں راضی ہوگئے، یہ گولڈ زیہر کی تحقیق کے بجائے سراسر تحریف ہے کہ امام زہریؒ نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان امراء نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اپنی طرف سے ایسی ایسی حدیثیں بنا کر پیش کریں جن سے بنی امیہ خوش ہوں، گولڈ زیہر نے ایک کارنامہ تو یہ انجام دیا، دوسری مثال جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ حافظ ذہبی کا یہ قول ہے:

لم یجتمع علماء ھذا الشان	علمائے فن کا کسی ثقہ کو ضعیف
علی تضعیف ثقة ولا علی	قرار دینے اور کسی ضعیف کی توثیق
توثیق ضعیف۔	کرنے پر اتفاق نہیں۔

امام ذہبی تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس راوی کے ضعیف ہونے پر علماء کا اتفاق ہو اس میں کلام ہی نہیں، اسی طرح جن کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے ان میں بھی کوئی کلام نہیں، کلام ان رواۃ میں ہے جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ ثقہ ہیں یا ضعیف؟ لیکن گولڈ زیہر نے اس کا یہ مطلب نکالا ہے کہ رواۃ میں کوئی ایسا راوی ہی نہیں ہے، جس پر علمائے فن کا اتفاق ہو، گویا وہ کتب رجال کے سارے ذخیرے ہی کو مشکوک قرار دینا چاہتے ہیں، ان کے یہاں اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں، مولانا سے درخواست ہے کہ وہ علمائے عرب میں ڈاکٹر مصطفےٰ سباعیؒ کی یہ کتاب بھی پیش نظر رکھیں تاکہ گولڈ زیہر کی تلبیسات کا اندازہ ہو اور معلوم ہو کہ انھوں نے اسلامی حقائق کو کس طرح مسخ کیا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اس کا جواب دینا چاہا، لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے مباحثہ روک دیا گیا، پھر اس اجلاس کے صدر ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تقریر عربی میں شروع ہوگئی۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

صدر صاحب نے پہلے مقالہ نگاروں کے مقالات پر اپنے کچھ خیالات ظاہر کیے، جس کو سن کر اس حیثیت سے تعجب ہوا کہ وہ اردو نہ جاننے کے باوجود ان کے مطالب سے کچھ نہ کچھ واقف ہوگئے تھے، ان کی رائے تھی کہ ایک ایک مستشرق پر علٰحدہ علٰحدہ مضمون لکھنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اہل نظر کے سامنے آجائے گا، پھر انھوں نے فرمایا کہ قدیم مستشرقین نے سیرت، حدیث، تاریخ، تصوف اور تمدن اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اور جدید مستشرقین کے جو خیالات و افکار ہیں، ان سب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، انھوں نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی کہ آج کل یہ مستشرقین خود آپس ہی میں

دست و گریباں ہیں، ایک داہنے جانب ہے تو دوسرا بائیں جانب ہے، اور وہ ایک دوسرے کی تردید و تنکیر میں لگے ہوئے ہیں، اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے کیونکہ اس طرح ہم کو ایک بڑی جنگ لڑنے سے بچنے کا موقع فراہم ہو گیا ہے، صدر موصوف نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ مستشرقین کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا مستشرقین کے تلامذہ کا ہے جو اب ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں اور ان مستشرقین ہی کے دماغ و عقل سے سوچتے ہیں، وہ اس لحاظ سے نسبتًہ زیادہ خطرناک ہو رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہوتے ہیں، ان کی تحقیقات و تالیفات مسلمانوں کے حلقوں میں بہت جلد پہونچ جاتی ہیں، اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس پر اعتماد بھی کر لیا جاتا ہے، ایسے افراد کا مقابلہ بھی کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

اس تقریر کے بعد پہلی نشست ختم کی گئی۔

(باقی آیندہ)

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

از مولانا سید سلیمان ندوی ؒ

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ؒ کے علمی و تحقیقی مضامین کا یہ بیش قیمت مجموعہ ہے، گو اس کے مضامین میں بڑا تنوع ہے، تاہم حدیث و سنت سے متعلق اس مجموعہ کے مضامین خاص طور پر معرکۃ الآرا ہیں، اس سلسلہ کے مندرجۂ ذیل چار مضامین میں حدیث و رجال حدیث کے بارہ میں مستشرقین کے اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی گئی ہے، اور ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے (۱) محمد بن عمر الواقدی اور سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی (۲) پھر واقدی (امام زہری پر الزام)، (۳) سنت (۴) پھر بحث سنت (کچھ اور اعتراضات و الزامات) قیمت ستر روپیے

"منیجر"

"اسلام اور مستشرقین" سے متعلق

خطوط

اٹک شہر (سابقہ کیمبل پور)

۱۹/۴/۸۱

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

"اسلام اور مستشرقین" کے عنوان سے بین الاقوامی سیمینار منعقد کرنے پر احقر کی جانب سے کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ دلی مبارکباد قبول فرمائیں، بحمدہ تعالیٰ دار المصنفین نے اسلام کی بہت اچھی خدمت کر کے اپنے لیے محشر میں سرخ روئی کا کافی سامان مہیا کر لیا ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔

اس موضوع پر مجلس مذاکرہ کا انعقاد وقت کی سب سے بڑی علمی و دینی ضرورت ہے، مغربیت زدہ مرعوب مسلمان مستشرقوں کو ہی عالم سمجھ کر ان کی اقتدار کرتے ہیں، حالانکہ ان کا مبلغ علم ناقص اور ان کی نیت بخیر نہیں، اگر اس سیمینار کی پوری رپورٹ کے ساتھ حتی المقدور ان کے مبلغ علم پر بھی مواد شایع کیا جائے تو اس سے بہترین نتائج پیدا ہوں گے، اس گناہ گار نے اپنی لغات مرتب کرتے وقت کچھ حوالجات جمع کیے تھے، جن میں چند پیش خدمت ہیں:

(۱) مشہور امریکی مستشرق فلپ کے حتی نے دی عرب نامی کتاب میں پرچم نبوی عقاب کے متعلق ترجمہ کرتے وقت "Eagle" لکھا ہے، پھر اس کا ترجمہ کرتے وقت عبد السلام خورشید نے لکھا ہے کہ:

"علم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس پر عقاب بنا ہوا تھا"

(عربوں کا عروج وزوال از عبدالسلام ص ۵۸)

حالانکہ تمام لغات عرب میں ہے، ھو ضربٌ من ثیاب الھودج الموشی۔

(۲) جرمن مستشرق فلوگل نے نجوم القرآن مطبوعہ ۱۹۰۶ء میں عجیب گل کھلائے ہیں، مثلاً لیزلقونك کو زُلفیٰ سے اور اِلحافًا کو اِلحاق سے اور فَاسْتَبِقُوا کو بقی سے اور فِردوس کو فَوْد سے مشتق قرار دیا ہے۔

(۳) پادری احمد شاہ نے مفتاح القرآن میں کئی اغلاط کا ارتکاب کیا ہے، مثلاً ثُلّۃ اور ثُمّۃ کو ایک سمجھ لیا، اور جَرَحْتُم کا معنی تم نے زخمی کیا، کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ جناب کو اپنے رفقاء کے ساتھ بافیت رکھ کر علوم اسلامیہ کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔

محتاج دعائے حسن خاتمہ: قاضی زاہد الحسینی دارالارشاد
اٹک شہر، پاکستان۔

(۴)

دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک ۲۹ راپریل ۱۹۸۲ء

مکرمی! السلام علیکم

معارف کی مارچ و اپریل کی اشاعتیں ایک ساتھ موصول ہوئیں، اس میں آپ کے قلم سے مستشرقین پر منعقدہ عالمی سمینار (اعظم گڈھ) کی روداد پڑھ کر اس سمینار کی اہمیت، عظمت اور افادیت کا احساس ہوا، روداد کی خوش سلیقگی اور حسن ترتیب دل کو بھاگئی، سمینار میں شریک ہوئے مہمان علماء اور اصحاب بینش و دانش کا تعارف جس بلیغ انداز میں ایجاز کے ساتھ آپ نے تحریر فرمایا ہے اور شخصیات کی "جلالت علم" کی قلمی تصویر، صفحۂ کاغذ پر جس پروقار انداز میں اپنے

موئے قلم سے کھینچی ہے، وہ آپ ہی جیسے فن کار مشاق اور آزمودہ کار قلم کار ہی کا حصہ ہے، دور بیٹھے ہوئے لوگ بھی سمینار کی روداد کی ان دو قسطوں کو پڑھ کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ گویا وہ بھی شریک محفل ہیں، آنکھوں دیکھا حال تو سبھی لکھتے ہیں، مگر آپ نے تو سمینار کی کارروائی کو قلم کے ذریعہ "ٹیلی کاسٹ" کر دیا ہے، معارف کا مطالعہ کرنے والا ناظر صرف کاغذ پر لکھی ہوئی کارروائی کا ہی مطالعہ نہیں کرتا، بلکہ اس تحریر کے آئینہ میں تقریر و تصویر دونوں کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ اور کانوں سے براہ راست سماعت کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے، یہ آپ کا کمال انشاء پردازی ہے۔

سمینار میں آپ کی خیر مقدمی تحریر اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ کے استقبالیہ ارشادات بڑے ہی بصیرت افروز ہیں۔

مستشرقین کے بارے میں آپ نے بڑی احتیاط مگر بڑی بے باکی کے ساتھ حقائق کا اظہار فرمایا ہے، اور مولانا شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ کے رہنما ارشادات کے اقتباسات پیش فرما کر سمینار کو صحیح سمت میں رواں دواں ہونے کا راستہ دکھایا۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب نے بجا طور پر مستشرقین کی جانبداری اور تعصب کو واشگاف فرمایا ہے، اور بڑے دلنشین اسلوب میں ظاہر فرما کر اپنی ژرف نگاہی اور بلند خیالی کا ثبوت مرحمت فرمایا، مولانا کی تقریر معلومات کا ایک بحر بیکراں تھا جس سے سمینار میں آنے والے جویائے علوم اور غواص معانی دُرہائے آبدار حاصل کیے ہوں گے، یہ سمینار اپنی انفرادیت و افادیت کے لحاظ سے بڑی قدر و منزلت کا حامل بن گیا ہے، دارالمصنفین اعظم گڈھ کی گذشتہ زریں خدمات کے ساتھ یہ اس کا جدید کارنامہ ایسا ہے جسے آنے والا مورخ سونے کے حروف سے لکھے گا، فی زمانہ ایسے تحقیقی سمینار کی اشد ضرورت تھی جس کا سہرا آپ کے سر ہے، خداوند کریم آپ کی یہ علمی سعی کامیاب کرے۔ والسلام

دعاگو: منظور الحسن برکاتی

ادبیات

غزل

از
جناب محمد حسین فطرتؔ بھٹکلی، بھٹکل

ہزار جام طرب بزم میں چھلک جائے
مرے شعور کو زیبا نہیں بہک جائے

جنوں میں خندۂ گل کا بہار نام نہیں
یہاں تو شرط ہے زخم جگر مہک جائے

ہوس کی چارہ گری سے کبھی نہیں ممکن
جگر کا داغ مٹے، درد کی کسک جائے

چمن کے پھول بھی نشتر زنی میں کیا کم ہیں
نگاہِ دہر میں کانٹا ہی کیوں کھٹک جائے

ترے لہو کا ہو فیضان صبح و شام اگر
تو کیا عجب ہے کہ پتھر پہ گل چٹک جائے

اندھیرا رات کا جگنو کی ضو سے دور نہ ہو
ہزار صحن گلستاں میں وہ چمک جائے

اگر ہو چارہ گری پر مسیحا آمادہ
مریض عشق کے سینے میں دم اٹک جائے

زمانہ کھوکھلے دعووں کا تو نہیں قائل
جسے ہے زعم جنوں دار پر لٹک جائے

امید رقص صبا تو نہیں ہے اے فطرتؔ
سموم وقت سے شاخِ چمن لچک جائے

باب التقریظ والانتقاد

مثنوی حزن اختر
(ایک جائزہ)

از جناب سبط محمد نقوی صاحب اکبرپور

مثنوی حزن اختر سلطان عالم واجد علی شاہ کی تصنیف ہے، جسے میرے کرم فرما نواب امجد علی خاں نے اچھی کتابت اور طباعت کے ساتھ خوش نما سرورق سے مزین کرکے تیسری بار شائع کیا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت بادشاہ مرحوم کی حیات میں انہی کے قائم کردہ مطبع سلطانی کلکتہ سے ۱۸۶۰ء (۱۲۷۶ھ) میں ہوئی تھی، اسے دوسری بار ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں محبوب علی صاحب ناظم دائرۃ ادبیہ لاٹوش روڈ نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا، اس اشاعت میں مولوی عبدالحلیم شررؔ مرحوم کا مقدمہ بھی شامل تھا،

زیر جائزہ اشاعت سے شررؔ مرحوم کا مقدمہ ساقط کر دیا گیا ہے، اور ۶۸ صفحات کے متن کے ساتھ ۱۵۶ صفحات کا سابقہ اور لاحقہ شامل کرکے ۲۲۴ صفحات پر کتاب مشتمل ہے، ان ۱۵۶ صفحات میں سے ۴۴ صفحات ڈاکٹر انیس اشفاق کے پیش لفظ پر مشتمل ہیں، جنہوں نے اسی کتاب سے اپنی مقدمہ نگاری کا افتتاح فرمایا ہے، بقیہ تمام کا تمام مرتب مکرم کے رشحاتِ قلم ہیں،

یہ پیش کش اس اعتبار سے بھی بڑی خصوصیت کی حامل ہے کہ اس کی بسم اللہ ہی غلط کی

گئی ہے یعنی مثنوی حزن اختر کے نام میں توضیحی فقرے خطوط وحدانی میں (واجد علی شاہ کی آپ بیتی) لکھے گئے ہیں، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کو داستان اسیری یا زندان نامہ کہا جانا چاہئے، آپ بیتی کی اصطلاح جس وسیع مفہوم کو محتوی ہوتی ہے، اس سے اُسے دور کا تعلق بھی نہیں. تقریبًا بارہ سو ابیات کے اس منظومے میں حمد، نعت، منقبت، ساقی نامہ کے علاوہ تقریبًا سو بیتیں ایسی ہوں گی جن میں انتزاع سلطنت اور مہاجرت کا ذکر ہے، ورنہ سب کا سب اسیری سے متعلق بیان ہے، یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ نوجوان اور صاحبِ صلاحیت پیش لفظ نویس نے مغز سخن تک پہونچنے کی زحمت نہیں کی، اور جابجا مثنوی کو آپ بیتی یا خود نوشت سے ہی تعبیر کیا ہے،

اس منظومے کو آپ بیتی قرار دینے کے باوجود فاضل مرتب نے بیان واقعی کے عنوان سے واجد علی شاہ کے حالات کا مبسوط بیان کیا ہے، اور وہاں بھی خشتِ اول کی کج نہادی ہی کار فرما ہے،

واجد علی شاہ کا سالِ ولادت واجد علی شاہ کے سنہ ولادت میں بڑے اختلافات ہیں، اس ضمن میں اُن کے اپنے بیانات میں بھی تباین ہے، اردو کے مایہ ناز محقق و نقاد پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے جو تاریخ اودھ پر محققانہ ہی نہیں گہری مبصرانہ نظر بھی رکھتے تھے، کافی تلاش و تفحص کے بعد مستند مدرک کی مدد سے سنہ ولادت ۱۲۳۷ھ قرار دیا تھا، مگر مرتب نے منشی رام سہائے تمنا، حکیم نجم الغنی خاں کے بیانات اور چھبن لال معجز کے قطعۂ تاریخ پر اعتماد کر کے سنہ ولادت ۱۲۳۸ھ تسلیم کر لیا، اور دلیل یہ دی کہ معجز کے قطعۂ تاریخ پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، مرتب مکرم غور فرماتے تو معجز کے قطعۂ تاریخ پر اعتماد نہ کرنے کے حسب ذیل وجوہ فورًا سامنے آجاتے (۱) چھبن لال معجز ایسے مشاہیر شعرا میں نہیں ہیں کہ جن کا

عہد معلوم ہو، بہت ممکن ہے کہ یہ قطعۂ تاریخ زمانۂ ولادت میں نہ کہا گیا ہو بلکہ تمنا کی کتاب افضل التواریخ کی تصنیف کے وقت کتاب کی زینت بڑھانے کے لئے کہا گیا ہو، راقم السطور کا خیال ایسا ہی ہے، کیونکہ پہلا مصرع "آسماں جاہ و ثریا منزلت" امجد علی شاہ کے خطابات کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور غالبًا یہ خطابات انہیں ولی عہد ہونے کے وقت ملے ہیں، اور یہ واقعہ امجد علی کی ولادت کے برسہا برس بعد کا ہے (۲) تمنا اور نجم الغنی، ۱۰ ذی قعدہ کے ساتھ روز سہ شنبہ کی قید لگاتے ہیں، اور یہ تاریخ منگل کے دن ۱۲۳۷ھ ہی میں واقع ہوئی تھی، ۱۲۳۸ھ میں تو ۱۰ ذی قعدہ یکشنبہ یا دوشنبہ کو واقع ہوئی تھی (۳) منشی تمنا نے کافی تصریح کی ہے کہ "۱۰ ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ مطابق سمبت ۱۸۷۹ اساون سودی دوادشی روز سہ شنبہ بعد ۵ گھڑی ۲۹ پل جیشٹا نچھتر اندر یوگ" جناب مرتب نے یہ عبارت نقل بھی فرمائی ہے پھر بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی، کہ تقویم سے اس کی تطبیق کر لی جائے، انھوں نے یہ زحمت برداشت کی ہوتی تو جو ٹھوکر کھائی ہے اور جو غلط فہمی پھیلائی ہے، اس سے بچے رہتے، واقعہ مختصرًا یہ ہے کہ سمبت اور ساون کی تاریخ بھی ۱۲۳۷ھ ہی سے مطابق ہیں، ۱۲۳۸ھ کی ۱۰ ذی قعدہ کو سمبت ۱۸۸۰ کے اساڑھ کی سدی تردوشی تھی، ساون نہیں (۴) مرتب محترم اودھ کے تحقیق کار ہی نہیں، ناٹک اور سینما کے اداکار بھی ہیں، اُن کی نظر میں یہ بات رہنی چاہئے تھی کہ واجد علی شاہ کے زائچۂ ولادت کے طالع کو منجموں نے منحوس بتایا تھا، اور تمنا کی لفظوں میں "رفع نحوست کی تدبیر واجب ہے اگر عہد سلطنت میں حالت فقیری اختیار کی جائے، تو نحوست بہ سعادت مبدل ہو جائے" اسی لئے واجد علی شاہ کی سالگرہ میں ان کی مادر گرامی پوشاک جوگیانہ پہناتی تھیں، اور بادشاہ ہو کر خود انھوں نے اسی وجہ سے ساون میں جوگیانہ میلے کی طرح ڈالی، اگر ان کی تاریخ پیدائش ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ ہوتی تو میلہ ساون میں نہیں اساڑھ میں ہوتا،

مرتب کی سہل انگاری نے اتنے ہی پر بس نہیں کی ہے، اور تحقیق کی راہ میں کمال بے فکری سے گذرے ہیں، موصوف نے عہد واجد علی شاہ کی اہم تاریخیں ص ۱۰۲ تا ۱۱۰ پر ذکر فرمائی ہیں، ان میں واجد علی شاہ کی ولادت ۳۰ جولائی ۱۸۲۲ء درج کی ہے، اور یہ ۱۲۳۷ھ ہی سے مطابق ہے، ۱۲۳۸ھ سے نہیں،

شادی | واجد علی شاہ کی شادی کا سنہ ۱۲۵۳ھ بتایا جاتا ہے، غالباً اس غلطی کی ذمہ داری خود سلطان عالم کے بیان پر ہے، کیونکہ ان کی نثری تصنیف عشق نامۂ فارسی کا جو ترجمہ مرزا فدا علی خنجر نے محل خانہ شاہی کے نام سے کیا ہے، اس میں یہی سنہ مذکور ہے تحقیق کے ساتھ تو عرض نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مسامحہ ماتن، مترجم یا کاتب میں سے کس کا ہے لیکن لیکن قیاس کا قرینہ کہتا ہے کہ یہ غلطی متن میں ہی راہ پا گئی ہے ورنہ پروفیسر مسعود حسن مرحوم ادیب ایسے دیدہ ور محقق کی نظر متن و ترجمہ کے اس اختلاف پر اٹکے بغیر نہ رہتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی شادی سنہ ۱۲۵۲ھ میں ہوئی تھی، اس سلسلے میں واجد علی شاہ کے دو بیانات ایسے ہیں جن میں غلطی کیا، غلط فہمی کی بھی ادنی گنجایش نہیں (۱) مانجھے کی تاریخ ۱۵ ر شعبان تھی، ۱۵ ر شعبان اس فرقے میں جس سے بادشاہ مرحوم تعلق رکھتے تھے خصوصی اہمیت کی حامل ہے، اور بطور جشن ولادت امام عصرؑ منائی جاتی ہے (۲) یہ تقریب نصیر الدین حیدر شاہ مرحوم کی حیات میں ہوئی، اور تقریب شادی کے ۵ مہینے بعد ان کا سانحۂ وفات پیش آیا، یہ امر مسلّمہ ہے کہ نصیر الدین حیدر شاہ کا انتقال ۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۵۳ھ کو ہوا، اُن کی حیات کا آخری شعبان سنہ ۱۲۵۲ھ میں ہی واقع ہوا تھا، اور واجد علی شاہ کی پہلی شادی کا سال وہی ہے جو اس طرف اگر پہلے کسی کی نگاہ نہیں گئی تو یہ محض اتفاق ہے،

اس مبحث میں ہمیں یہ دیکھ لینا چاہئے کہ واجد علی شاہ کے پہلے خسر کا نام کیا تھا اور زیر نظر

کتاب میں محل خانہ شاہی کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے، اس میں نواب علی تقی خاں لکھا گیا ہے، خود محل خانۂ شاہی میں نواب علی نقی خاں بہت صاف لکھا ہے؛ اور یہ دونوں بداہتہً غلط ہیں، کیونکہ نواب علی نقی خاں کی صاحبزادی سے عقد ثانی ہوا، اور وہ وزیر اعظم بھی ہوئے اس لئے خسر کی حیثیت سے بھی سب سے زیادہ شہرت پائی، اس لئے متن میں نواب علی خاں پڑھ کر مترجم نے یہ سمجھا ہوگا کہ نقی لکھنے سے ترک ہو گیا ہے اور انھوں نے نقی کا اضافہ کر دیا، مثنوی حزن اختر کے مرتب نے یہ خیال کیا کہ نواب علی نقی تو دوسرے خسر تھے پہلے خسر ان کے چچازاد بھائی تھے، اس لئے انھوں نے نقی کو تقی بنا دیا، جب کہ اصل یہ ہے کہ اصل نام نواب علی خاں تھا، جیسا کہ ادیب مرحوم نے سلطان عالم واجد علی شاہ (ایک تاریخی مرقع) میں افادہ فرمایا ہے،

واجد علی شاہ کے سب سے بڑے بیٹے فاضل مرتب نے اس سوال پر جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کے نفس و ضمیر کی کشاکش کا روشن آئینہ ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ برجیس قدر واجد علی شاہ کے سب سے بڑے بیٹے نہیں ہیں لیکن برجیس قدر بہادر مرحوم کے وارث و جانشین شہزادہ انجم قدر بہادر کا تقرب مجبور کرتا ہے، کہ برجیس قدر کو اسی حیثیت سے پیش کیا جائے، اور اس سوال پر مرتب عزیز کی کیفیت صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں، والی ہو گئی ہے، ہر چند تفصیل میں طوالت ہے لیکن یہ مہمل نہیں ہوگی، ناظرین گرامی کے لئے دلچسپ بھی ہو سکتی ہے اور موجب عبرت بھی واقعہ یہ ہے کہ برجیس قدر واجد علی شاہ کے چوتھے بیٹے تھے، مگر اب مصالح متقضی ہیں کہ انھیں ولد اکبر ثابت کیا جائے، اس سلسلے میں مرتب مکرم کی سعی قابل دید ہے، کتاب کے انتساب میں منسوب الیہ کے تعارف کے سلسلے میں رقم فرمایا ہے کہ "..... حضرت برجیس قدر بہادر آخری تاجدار اودھ خلف اکبر حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ اختر بادشاہ اودھ ....." کمال حسن ظن کو

راہ دی جائے تو مان سکتے ہیں کہ یہاں لفظ "خلف" اصطلاحی معنی میں نہیں لغوی معنی میں استعمال کی گئی ہے،
کیونکہ بادشاہ کے پسماندہ صاحبزادگان میں برجیس قدر بہادر سب سے بڑے تھے، مگر اس کے بعد ص۶۲
پر ارشاد ہوتا ہے "..... واجد علی شاہ کے سب سے بڑے بیٹے اور پہلی جنگ آزادی کے ہیرو"
....." یہاں تو تاویل سے کام نہیں چلتا، سب سے بڑے بیٹے کا مطلب لڑکا اکبر ہی ہوتا ہے، یہ
بات بھی نہیں کہ مرتب اس حقیقت سے بے خبر ہوں، موصوف نے اس ترتیب سے پہلے بھی اودھ
پر ۲ کتابیں لکھی ہیں، ایک تاجدار اودھ، دوسری "تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ"، پہلی کتاب
توفی الوقت پیش نظر نہیں ہے، مگر دوسری کتاب (ص ۲۰۲) میں برجیس قدر کو تیسرا بیٹا
بتاتے ہیں، یعنی حامد علی اور فریدوں قدر کے بعد، اس کتاب میں حالات تو بسط سے لکھے
ہیں، لیکن بیٹے کے عنوان سے کچھ بھی نہیں لکھا، تاکہ یہ ذکر مستقل یا بلا واسطہ عنوان سے
آہی نہ سکے، اور یہ سب مطالبۂ نفس کی تکمیل میں تھا، لیکن اسے ضمیر کی ہدایت سمجھنا چاہیے،
کہ مثنوی کے متن سے وہ ابیات حذف یا مسخ نہیں کئے گئے، جس میں بادشاہ مرحوم نے اپنے
فرزندوں کا ذکر فرمایا ہے، اور نہ عنوان کی عبارت میں تحریف کی گئی ہے، ہم کتاب کے
کے صفحہ ۱۷۲ پر "ذکر حال شہزادۂ چہارم موسوم بہ مرزا برجیس قدر بہادر طول عمرہٗ" کا عنوان اور
اس کے ذیل میں پانچ ابیات پاتے ہیں، دو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں،

جو وہ چوتھا شہزادۂ رشکِ بدر — اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر
وہ ہے قبضۂ مفسداں میں ہے آہ — بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ

کتاب کے ص ۶۳ پر واجد علی شاہ مرحوم کی رحلت کے بعد ان کے متوسلین کے
ایک وفد کے برجیس قدر بہادر کی خدمت میں جانے، اسی وفد کے ساتھ برجیس قدر کے کلکتہ
تشریف لانے اور انگریزی فوجوں کے برجیس قدر کو محاصرہ میں لے لینے، پھر وائسرائے کا

پیام آنے وغیرہ کا بیان ہے، یہ ایسی چیز ہے، جو اب تک تاریخ اودھ سے متعلق کہیں بھی نظر قاصر
سے نہیں گزری ہے، تحقیقات جدیدہ کا ماخذ یا راوی کا ذکر کرنا محقق کی اولین ذمہ داریوں
میں سے ہے، لیکن فاضل محقق نے یہ ذمہ داری پوری نہیں کی،

دیانت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بعد وفات واجد علی شاہ مٹیا برج کی تباہی کے بیان میں ان
مساعی کا ذکر بھی کیا جائے، جو وہاں کے عزا خانہ بیت النجات کے تحفظ میں بادشاہ مرحوم
کے برادر زادے اور خویش مرزا جہاں قدر بہادر نے انجام دیئے تھے، اور اس تعاون کا حوالہ
بھی آئے جو مہاراجہ سر پرتاب نرائن سنگھ اور خان بہادر چودھری نصرت علی کی تحریک سے
اودھ کے تعلقداروں نے پیش کیا تھا، لیکن صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سب چیزیں ارادی طور پر
محذوف مستور کی جا رہی ہیں،

بادشاہ مرحوم پر وارد کئے جانے والے الزامات و اتہامات کی صفائی کے سلسلے میں مسجد
اجودھیا اور مولوی امیر الدین علی کی عزیمت کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، اس سلسلے میں مرتب کے
رویے کو دھاندلی کے علاوہ کسی اور چیز سے تعبیر ہی نہیں کر سکتے، مرزا جان کی "حدیقۂ شہدا"
کے تعارف میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے یہ اشعار ہوتا ہے کہ کتاب فاضل مرتب کی نظر انور
سے گذر چکی ہے، لیکن جہاں جہاں اقتباس یا حوالہ آیا ہے وہ مولوی رئیس احمد جعفری ندوی
جامعی مرحوم کی تصنیف "واجد علی شاہ اور اُن کا عہد" کی معرفت آیا ہے، اور جہاں جہاں بھی
اقتباسات میں نواب لکھا گیا ہے، وہاں خطوط وحدانی میں بادشاہ کا اضافہ کرکے وزیر علی نقی خاں
کے اقدامات کو بادشاہ کے سر منڈھ دیا گیا ہے، جعفری صاحب مرحوم کثیر لجات بسیار نویس
مصنف تھے، عام طور سے مشہور ہے، کہ وہ اخذ و اقتباس کا کام بھی اپنے رفقاء و معاونین سے
لیا کرتے تھے، مرحوم نے اودھ کی تاریخ کو اپنے خصوصی مطالعہ کا موضوع بھی نہیں بنایا تھا،

اگر نواب سے کہیں انھوں نے بادشاہ مراد لے لیا تو چنداں قابلِ اعتراض و استعجاب نہیں کیونکہ غازی الدین حیدر کے وسط دورِ حکومت تک اودھ کے فرمانروا نواب یا نواب وزیر کہے جاتے ہی تھے، لیکن نواب امجد علی خان جو تاریخ اودھ کا خصوصی مطالعہ فرما رہے ہیں، زیر نظر کتاب سمیت اب تک تین تاریخی کتابیں پیش فرما چکے ہیں، اس موضوع پر جو نا تک لکھے اور کھیلے ہیں وہ مستزاد ہیں، وہ نواب کو عصری مصنف کی تحریر میں بادشاہ سمجھیں، اور بطور توضیح اس لفظ کا بلا استثنا ہر اقتباس میں اضافہ فرمائیں، نہایت نازیبا ہے، نواب امجد علی خاں کی عبارتوں یا اُن کے مقتبس حصوں کے نقل و اعادہ کی ضرورت نہیں ہے ہم اصل کتاب کے ایسے حوالے حاضر کرتے ہیں جس سے یہ بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ مرزا جان اور خود مولانا امیر علی بادشاہ کو بادشاہ اور نواب کو نواب ہی سمجھتے ہیں، یہ امر غیر اختلافی ہے، کہ غازی الدین حیدر شاہ کے اعلان بادشاہت کے بعد وزیر کو نواب کہا جاتا رہا ہے، اور علی نقی خاں کا خصوصی خطاب حضور عالم تھا، اقتباسات اس امر کی بھی شہادت پیش کریں گے، کہ اصل معاملہ سے بھی بادشاہ کو بڑی حد تک ناواقف رکھا گیا، اب آپ حدیقہ شہدا کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں،

(۱) دیباچہ (ص ۳) "غدر تقصیر مدح سلطان و وزیر بعد حمد و نعت کے محرّروں کا دستور ہے کہ بادشاہ وقت اور اس کے وزیر کا زبانِ قلم سے مذکور ہوتا ہے لیکن اس مختصر میں اول سے آخر تک انہی حضرات کا ذکر ہے اس لئے عاصی نے اغماض کیا،"

(۲) "اس کے بعد کہتے ہیں (ص ۷) عہدِ حکومت محمد علی شاہ فردوس منزل میں پھر اذان کی رسم جاری ہوئی ،....."

(۳) مصنف آگے بتاتا ہے (ص ۱۵) "چنانچہ ان دو تین صاحبوں نے کیفیت راست بے کم و کاست.... بارگاہ شاہی ہند و پناہی میں ارسال کی ہے،"

(۴) یہ بہت واضح اور بین شہادت ملاحظہ فرمائیں، (ص ۱۷) "............ یہ فقرہ جما کے نواب کے پاس آکر عرض کرنے لگے کہ حضور عالم! یہ کیفیت جو دونوں مولویوں کی دو حرفی ہے، اس کا کیا اعتبار یک طرفی ہے، اس پر تعمیر مسجد کا حکم لگانا، اور اپنی رعایا کو ستانا ضعف عملداری، بلکہ رعیت آزاری ہے، آپ نایبِ سلطان ہیں، آپ کے نزدیک برابر ہندو و اہلِ مسلمان ہیں"

راقم کا خیال ہے کہ یہ اقتباسات کسی کو بھی یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہیں کہ مرزا جان سلطان و نواب کے فرق سے ہی واقف نہ تھے، بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضور عالم نواب کا لقب ہے، ذیل کا اقتباس یہ ثابت کر دیگا کہ اس معاملے سے بادشاہ کو زیادہ تر ناواقف رکھا گیا،

(۵) حاجی بشیر الدولہ کے بارے میں مصنف کہتا ہے، (ص ۲۶) "...... اسی بہادر کے ذمہ مجاہدوں کا خرچہ برچہ رہتا تھا، سلطان عالم سے بھی موقع پر کچھ ذکر آجاتا تھا، لیکن نواب کے خوف سے زبان دبا جاتا تھا، جیسا یہ ایک ہے اگر دو چار اور بھی ہوتے تو کاہے کو مسلمان مسجد کو روتے، اور بادشاہ کا وہ عالم کہ بالکل غافل ...... اگر بادشاہ ہوشیار ہوتے تو بشیر الدولہ بہادر کی جوہر دینداری نمودار ہوتی (کذا)،

اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں، لیکن طوالت بے جا سے کوئی حاصل نہیں، اب ہم مولوی امیر الدین علی کے منظوم عریضے سے چند ابیات نقل کرتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت نواب و وزیر کا نیز ان کے القاب و خطابات کا امتیاز آج کی طرح لامعلوم نہ تھا، یہ ابیات مولوی امیر الدین علی کی موزونِ طبعی اور قدرت شاعری کا بھی نمونہ پیش کریں گی، ؎

امید ہے کہ شہنشاہِ قبلۂ عالم ابو المظفر و منصور و خسرو اعظم

سپہر رفعت و قدسی صفات و الاجاہ — خدیو کشور ہندوستاں فلک درگاہ

محب پنجتن پاک، فتخار زمیں — خلیفہ رسبحانی و تاجدار زمن

جناب واجد علی شاہ ظلِ سبحانی — رئیس امت والا حبیب رحمانی

زبانِ فیضِ مبارک سے یوں کریں ارشاد — کہ کافران اودھ پر شتاب ہوئے جہاد

وزیر حضرتِ خاقان حضور عالم دیں — کریں وہ دستخط والا اس امر پر تزئیں

بعہد میمنتِ عہد حضرتِ سلطاں — جناب واجد علی شاہ سایۂ رحماں

لوائے نصرت اسلام ہو گیا استاد — بسمت شہر اودھ والا نہ ہے عزم جہاد

غریب و بیکس و مسکین و بادلِ غمگیں — محب آلِ نبی عبدہٗ امیر الدین"

(صفحہ ۳۵)

مرتب صاحب نے واجد علی شاہ کی صفائی میں باتیں تو بہت بنائی ہیں لیکن اُن کے ایسے بیانات کو نظر انداز کیا ہے جو ٹھوس شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں، مثنوی ثبات القلوب کا طویل اقتباس دیباں واقعی میں مرتب نے شامل کیا ہے لیکن ان ابیات پر جس میں سلطان عالم نے اس واقعہ کا اظہار کیا ہے، اس کی ذمہ دار انگریز کمپنی کو قرار دیا ہے اور مولوی امیر الدین علی کو شہید سے تعبیر کیا ہے، توجہ نہیں فرمائی، تین بیت آپ ملاحظہ فرمائیں، ؎

یہاں تک سلیمن نے زور کیا — رعایا کو بھڑکایا ہر ایک جا

پھر آخوند صاحب کو لڑوا دیا — شہید اُن کی فوجوں نے ان کو کیا

ہنوز ان گڑھے پر کیا کچھ خیال — کبھی حکم گردن زدن بے مآل

ویسے تو مرتب کی چابکدستی کے اور بھی نمونے ہیں، لیکن اب مجھے تخفیف زحمت کرنا چاہیے پھر بھی دو موارد ایسے ہیں جن کی طرف قارئین گرام کو متوجہ کرنا از بس ضروری سمجھتا ہوں، ایک

عہد واجد علی شاہ کے عنوان سے مرتب جدول میں ۱۸۶۲ء کے واقعات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ

" کلکتے کے کچھ تاجروں نے سازش کر کے واجد علی شاہ پر چالیس لاکھ روپیے کے فرضی قرضے کا دعوی کر دیا" یہ سراسر منشی صفدر کی حرکت ناشایستہ کو چھپانے کی برملا کوشش ہے اس سلسلے میں سب سے مستند وزیر نامہ مصنفہ وزیر السلطان منشی سید وزیر علی خاں کا بیان ہے وزیر السلطان اس سیاق میں عصری مصنف ہونے کے علاوہ اس مقدمہ سازش کے پیروکار کی بھی اہمیت کے حامل ہیں، افسوس ہے کہ طوالت سے بچنے کی خاطر اُن کے اقتباسات پیش کرنا ممکن نہیں ہے، صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ یہ دعوی کلکتہ کے تاجروں نے نہیں، بلکہ منشی صفدر علی کے داماد طالب علی نے بیالیس ۴۲ لاکھ روپیے کا کیا تھا، اس سلسلے میں وزیر نامہ کے ص ۲۵۶ اور اس کے بعد کے اوراق جویائے تفصیل و تحقیق کے لئے کارآمد و مفید ثابت ہوں گے۔

ختم کلام میں مذکورہ جدول کی اس طرفگی کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ۱۸۶۲ء سے لے کر ۱۸۸۷ء کی ربع صدی کی طویل مدت میں مرتب صاحب کو دو ہی واقعے قابل ذکر نظر آئے، ایک ۱۸۷۹ء میں حضرت محل کا انتقال اور ۱۸۸۷ء میں خود واجد علی شاہ اختر کی رحلت، اگرچہ اس ۲۵ سال کی مدت میں بہت کچھ ہوا ہے، مگر اس کا تفصیل کا اس تبصرے میں محل نہیں، یار زندہ صحبت باقی، انشاء اللہ تعالی

مطبوعات جدیدہ

العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ و طباعت بہتر، کتابت ٹائپ، صفحات ۳۱۲

قیمت ۲۵ روپیے، پتہ: ادارہ ملیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ، (یوپی)

ہندوستان کے ابتدائی قدیم عہد کی اسلامی تاریخ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کا خاص موضوع ہے، اس پر ان کی اردو اور عربی میں متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں، زیر نظر عربی کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس کا پہلا اڈیشن بارہ تیرہ برس قبل شایع ہوا تھا، اور اسی وقت اس پر معارف میں تبصرہ بھی کیا گیا تھا، یہ نیا اڈیشن بعض اضافوں کے بعد شایع ہوا ہے، نیز یہ دو جزوں پر مشتمل ہے، پہلے جزمیں عہد رسالت، خلافت راشدہ اور بنی امیہ کے زمانہ کے عرب و ہند کے تعلقات کا ذکر ہے، اور دوسرے جز میں خلافت عباسیہ کے دور کے دونوں ملکوں کے تعلقات دکھائے گئے ہیں، پہلے جز کے شروع میں ہندوستان کی فتوحات کی قدیم عربی تصنیفات کا ذکر اس کے محل وقوع، یہاں صحابہ و تابعین کی تشریف آوری اور مختلف دور میں فتوحات کا اجمالی حال تحریر کیا ہے، پھر عہد رسالت میں عرب میں آباد ہندوستانی قوموں زط وسیابجہ، آنحضرت صلعم اور صحابۂ کرام کی ہند و اہل ہند سے واقفیت اور ان کے بعض ہندوستانی اشیاء کے استعمال اور آنحضرت صلعم کے غزوۂ ہند کی خبر و بشارت وغیرہ متعدد باتوں کا تذکرہ ہے، اس ضمن میں کئی بے سروپا روایتوں کی تردید بھی کی ہے جو ہندوستان کے تعلق سے آپ صلعم کی جانب

منسوب کی جاتی ہیں، اس کے بعد خلافت راشدہ اور اموی دور میں ہندوستان کی سرحدوں اور بعض علاقوں میں مسلمانوں کی فتوحات، امراء و والیان ریاست، مجاہدوں اسپہ سالاروں اور ان داعیوں و مصلحین کے حالات بھی لکھے ہیں جو غزوات و فتوحات یا دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں یہاں آئے، مصنف نے ان سب کے صحابی، تابعی اور تبع تابعی ہونے کی بھی صراحت کی ہے، آخر میں اس زمانہ کے مشہور ہندوستانی علماء و محدثین کا مختصر تذکرہ ہے، دوسرے جزء میں پہلے عباسی خلیفہ ابو العباس سفاح (سنہ ۱۳۲ھ سے مطیع بللہ کے دور سنہ ۳۴۰ھ) تک کا ذکر ہے اس میں آل عباس کی طرف سے مقرر کیے جانے والے امراء کی ولایات و امارات کا تذکرہ اور بعض ہندوستانی راجاؤں اور عباسی خلفاء کے درمیان ہدایا و تحائف بھیجے جانے کا ذکر ہے۔

یہ کتاب مصنف نے بڑی محنت اور برسوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے، اور اس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی آمد اور فتوحات وغیرہ کے بارہ میں مستند اور مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، اس موضوع پر کام کرنے والوں کو اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی۔

عقیدت کے پھول از جناب محمد عثمان عارف نقشبندی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع خوشنما گردپوش، قیمت ۲۵ روپیے۔ پتے: (۱) انجمن ترقی اردو، راؤز ایونیو، نئی دہلی (۲) آستانہ بکڈپو، جامع مسجد، دہلی (۳) مکتبہ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

جناب محمد عثمان عارف نقشبندی، مرکزی نائب وزیر تعمیرات و مکانات حکومت ہند ایک علمی و مذہبی گھرانے کے فرد اور نقشبندیہ سلسلۂ طریقت سے وابستہ ہیں، ان کو شعر و سخن کا اچھا ذوق ہے، مگر ان کی شاعری رخ و گیسو کی حکایت اور زلف و شانہ کی مصوری کے بجائے ان کے پاکیزہ خیالات اور مذہبی جذبات کا آئینہ ہوتی ہے، زیر نظر کتاب ان کی نعتوں کا مجموعہ ہے اس کے

آخر میں سلام و منقبت اور بزرگانِ دین کو نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے، پہلی نظم میں قرآن مجید کی عظمت و برکت، اس کے اعجاز و حسن بیان اور تعلیم رشد و ہدایت کے علاوہ اس امر کا خاص طور پر ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے بڑھ کر کوئی اور ثنا خواں نہیں ہو سکتا، اس سلسلہ میں اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرنے کے باوجود انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اللہ کی توفیق و یاوری سے فکر و خیال میں تازگی و ندرت، الفاظ میں زور و اثر اور سخن میں دل آویزی و رعنائی پیدا ہو سکتی ہے، اسی احساس نے ان کو نعت گوئی پر آمادہ کیا، ان کے سلسلۂ نعت کی ابتدا ظہور قدسی سے ہوئی ہے، اس میں آپؐ کی تشریف آوری کے مجسم خیر و برکت ہونے کا مختلف حیثیتوں سے دلآویز پیرایہ میں ذکر ہے، اس نظم کے آخر میں "تمنائے مدینہ" کا اظہار بھی ہے، جو دوسری نظم کی تقریب بنا، ایک اور نظم میں آنحضور صلعم کی عظمت شان اور آپؐ کے درجہ و مرتبہ کی بلندی بڑے موثر انداز سے واضح کی ہے، اس مجموعہ کی تمام نعتیں عارف صاحب کے نبی اکرمؐ کے مرتبہ و درجہ کے عارف و عظمت شناس ہونے کے علاوہ آپؐ کی ذات سے ان کی والہانہ عقیدت و محبت اور آپؐ کی دعوت و پیغام سے ان کی دلچسپی و شیفتگی کا ثبوت ہیں، اس مجموعہ میں کئی اچھی تضمینیں بھی ہیں، ان سے مصنف کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے، امام حسینؓ کی مدح و منقبت اور واقعۂ کربلا سے متعلق بھی چند نظمیں ہیں، ان میں جہاں امام ہمام کی مظلومانہ شہادت اور تاریخ اسلام کے اس خونچکاں واقعہ کا درد انگیز بیان ہے، وہاں آپ کے درس و پیام کی جانب بھی خاص طور پر توجہ دلائی ہے، اور اس ضمن میں بعض مروجہ رسموں اور طریقوں پر لطیف طنز و تبصرہ بھی ہے، آخر میں بزرگان دین کے کارنامۂ ارشاد و ہدایت کو موثر انداز میں بیان کیا ہے اور شریعت و طریقت کے ان داعیوں سے اپنی نسبت و تعلق کو اپنے لیے مایۂ فخر بتایا ہے، نعت گوئی ایک نازک اور مشکل صنف سخن ہے، اچھے اچھے شعراء بھی اس کوچہ میں ڈگمگا جاتے ہیں، عارف صاحب جوش عقیدت میں بھی بڑی حد تک اعتدال و توازن پر قائم رہتے ہیں، ان کا یہ مجموعہ ان کے ادبی ذوق کی طرح ان کی

دینی و ایمانی کیفیت کا بھی نتیجہ ہے، شروع میں جمہوریۂ ہند کے نائب صدر عالی جناب محمد ہدایت اللہ کا پیش لفظ اور نعت نگاری پر جناب عارف کا بڑا متوازن دیباچہ ہے جو ادبی حیثیت سے خاصے کی چیز ہے۔

تحریک اسلامی اور برادران وطن

:۔ از جناب مولوی سید حامد علی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۸، قیمت دو روپے۔ پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶

اس کتابچہ میں ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو صرف مسلمانوں ہی کے سامنے شہادت حق کو کافی سمجھتے ہیں، مصنف نے ثابت کیا ہے کہ شہادت علی الناس کا خاص اقتضاء یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جائے، ان کا استدلال یہ بھی ہے کہ اسلام نہ تو صرف مسلمانوں کے لیے ہے اور نہ یہ ان کی کوئی قومی تحریک ہے، بلکہ سارے انسانوں کے لیے ہے، اور وہ ایک بین الاقوامی تحریک ہے، مصنف کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے مگر وہ اس کی بھی یہ کمی اور کوتاہی بتاتے ہیں کہ غیر مسلموں میں اسلام کی نشر و اشاعت کی ضرورت تسلیم کرنے کے باوجود اس نے بھی عملاً اپنا دائرۂ تبلیغ صرف مسلمانوں تک محدود رکھا ہے، آخر میں غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت و اشاعت کے بعض موانع بیان کر کے ان کے ازالہ کی صورتیں بتائی ہیں، کتابچہ اپنے موضوع پر مفید ہے، مگر مصنف کے انداز بیان سے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے اصلاح، تبلیغ و تواصی بالحق اور شہادت علی الناس کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے اور مسلمانوں کی اصلاح و تبلیغ اور انھیں حقیقی اسلامی زندگی اختیار کرنے کی دعوت کو وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں، اور ہندوستان میں مسلمان جن مخصوص مسائل سے دوچار ہیں انھیں حل کرنے کے بجائے غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ و دعوت ہی کو اصلی اور بنیادی کام سمجھتے ہیں، حالانکہ شہادت علی الناس کا نہ یہ مطلب ہے اور نہ غالباً مصنف کا یہ منشا ہوگا کہ مسلمانوں کو پختہ ایمان و اعتقاد خداوندی کی دعوت نہ دی جائے، کیونکہ خود قرآن کا ارشاد ہے کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا (اے ایمان والو!

ایمان لاؤ) اور آنحضرت صلعم کو آپ کے اس شدید اضطراب پر تنبیہ کی گئی ہے جو کفار و مشرکین کو اسلام کی جانب بلانے کے لیے آپ کے اندر پایا جاتا تھا، اور جس کی وجہ سے آپ کی توجہ مسلمانوں کی اصلاح و تزکیہ کی طرف سے کم ہو جاتی تھی، اس بنا پر اس وقت جبکہ خود مسلمان اسلام پر پوری طرح عمل پیرا نہیں ہیں ان کی اصلاح و تبلیغ کے کام کو غیر ضروری نہیں کہا جا سکتا ہے، دعوت و تبلیغ میں حکمت، موقع و حالات کی رعایت اور الاہم فالاہم کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، علاوہ ازیں غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ اسی وقت زیادہ کارگر ہو سکتی ہے جب مسلمان خود اسلام کے سچے حامل نہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بعض حلقے غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمانوں کی اصلاح و تبلیغ کو مقدم سمجھتے ہیں، ورنہ وہ بھی غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، تاہم جماعت اسلامی کی اس میدان میں بھی سبقت قابل ستائش ہے۔

صیانۃ الحدیث حصہ دوم: مرتبہ مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈانگری، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت چھ روپے، پتہ: مصنف کیر آف خان کلاتھ ہاؤس، ڈاکخانہ رام وت گنج، ضلع بستی۔

یہ اس کتاب کا دوسرا حصہ ہے، اس میں طبقۂ تابعین و تبع تابعین کے ممتاز محدثین کی ان مساعی کا ذکر ہے جو احادیث کی حفاظت و صیانت اور جمع و تدوین کے سلسلہ میں انھوں نے انجام دی ہیں، لائق مصنف نے اس ضمن میں ان بزرگوں کے حدیث نبوی سے شغف، حفظ و ضبط میں کمال، نقل و روایت میں مکمل احتیاط اور عدالت و دیانت کے مستند واقعات بھی بیان کیے ہیں، تابعین میں امام نافع، ہمام بن منبہ، قتادہ، امام شعبی، امام زہری، حضرت عمر بن عبد العزیز اور امام شعبہ وغیرہ اور تبع تابعین میں ابن جریج، امام مالک، عبد اللہ بن مبارک، وکیع بن جراح، عبد الرحمن بن مہدی، معمر بن راشد، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، امام ابو زرعہ، یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل اور کئی دوسرے بزرگوں کا ذکر ہے، آخر میں ائمۂ صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام نسائی اور امام ترمذی کا تذکرہ ہے، ان بزرگوں کے مختصر ترجمہ کے علاوہ اہم اور ممتاز کتب حدیث کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، اس مفید کتاب سے ائمۂ حدیث کی روایات و احادیث کے اخذ و بیان میں اہتمام بلیغ کا اندازہ بھی ہوگا اور منکرین حدیث کے بعض بے بنیاد الزامات کی تردید بھی ہوگی۔ "ض"

جلد ۱۲۹ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۲ء عدد ۶

مضامین